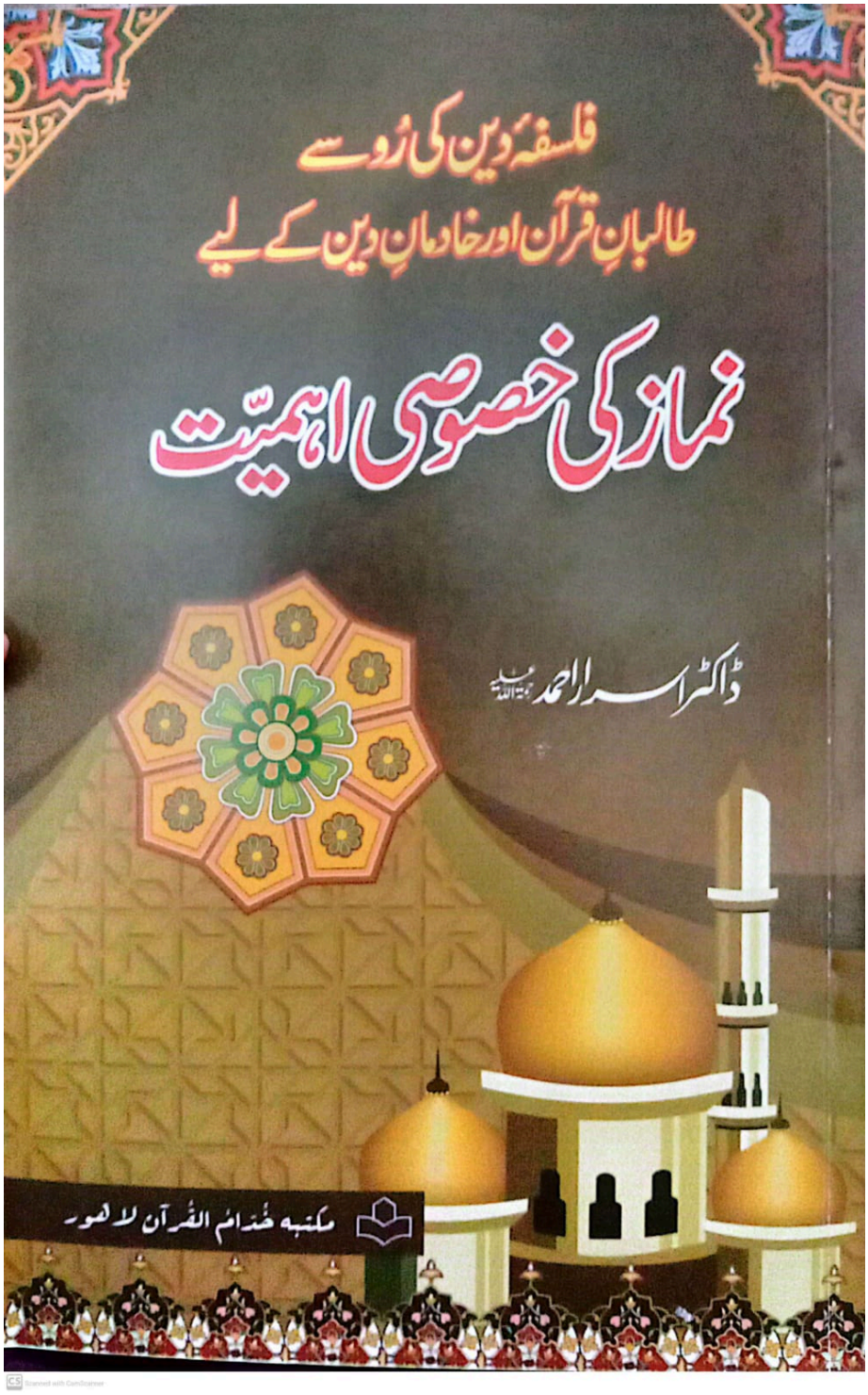

فلسفہ دین میں نماز کی اہمیت

ڈاکٹر اسرار احمد

فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ وَ مَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَ ہُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾ } (لقمٰن)

{یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾} (لقمٰن)

{اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۴﴾} (طٰہٰ)

{اِنِّیْ وَجَّہْتُ وَجْہِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۹﴾}(الانعام)

معزز سامعین کرام !

میں سب سے پہلے قرآن کالج کی انتظامیہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے یہ دو روزہ صلاۃ کیمپ منعقد کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کالج کی پہلی تقریب ہے جو اس کے مقصدِ قیام کے ساتھ بڑی گہری ہم آہنگی رکھتی ہے۔ پھر یہ کہ جس منظم انداز میں اس پروگرام کو ترتیب دیا گیا ہے' میں اس پر بھی منتظمین کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دین کے اہم اور بنیادی موضوعات پر آئندہ بھی اسی طرح کے تربیتی کیمپ منعقد کرتے رہیں گے۔

آج میری گفتگو کا عنوان ہے: ''فلسفہ دین میں نماز کی اہمیت''۔ اس میں سب سے

پہلے توجہ دلائوں گا کہ لفظ 'فلسفہ' نہ تو اصلاً عربی کا ہے اور نہ ہی یہ قرآن حکیم کی اصطلاح ہے ۔ یہ لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے یونانی ہے اور یہ 'فلاسفی' سے بنا ہے۔ اگرچہ 'فلسفی' آج کل عربی میں استعمال ہوتا ہے اور 'فلاسفہ' اس کی جمع ہے' لیکن واقعتاً یہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اسی کی ایک مثال لفظ 'تصوف' ہے' جو بظاہر تفعل کی وزن پر عربی زبان کا صیغہ معلوم ہوتا ہے' لیکن درحقیقتیہ بھی یونانی 'الاصل لفظ ہے اور یہ تھیوصوفی (Theosophy) سے بنا ہے' جسے معرب بنا کر عربی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

فلسفہ سے ہم جس علم یا جس شعبہ علم کو مراد لیتے ہیں' قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس کے لیے لفظ 'حکمت' ہے۔ اس کا مادہ 'ح ک م' ہے اور اس کا بنیادی مفہوم وہی ہے جو اس سے مشتق لفظ استحکام کا ہے یعنی کسی شے کا مضبوط ہوجانا' پختہ ہوجانا' قوی ہوجانا۔ ایسی صلاحیت حاصل کر لینا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے اور اپنے خلاف کسی بھی اقدام پر اپنا دفاع کر سکے۔ یہ ح ک م کے مادے کا اصل مفہوم ہے اور حکمت انسان کے فکر اور اس کے شعور کی پختگی کا نام ہے۔ اس لیے کہ انسان مختلف اعتبارات سے حیوانات سے ممیّز ہے اور ان میں سب سے اہم اعتبار یہ ہے کہ یہ حیوانِ عاقل اور حیوانِ ناطق ہے۔ یاد رکھیے کہ نطق اور عقل کا بڑا گہرا ربط و تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ عقل سے انسان کو شعور حاصل ہوتا ہے اور نطق کی بنیاد یہی شعور ہے۔ تو انسانی فکر اور شعور کی پختگی ' اس کے اندر ایسی صلاحیت کا پیدا ہو جانا کہ وہ حقائق تک رسائی حاصل کر سکے' اس میں اتنی قوت پیدا ہونا کہ وہ صحیح رخ پر قائم رہے اور صحیح رخ سے موڑنے والے تمام محرکات کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکے' یہ حکمت ہے۔ لہٰذا اب آپ ''حکمت ِدین میں نماز کی اہمیت'' کے موضوع کو ذہن میں رکھیں اور اس ضمن میں ہمیں یہاں سے ابتدا کرنی چاہیے کہ حکمت دین کا سب سے بنیادی مسئلہ کون سا ہے۔

معرفت ِخداوندی اور فطری جذبۂ تشکر

حکمت ِدین کا سب سے اہم' بنیادی اور اوّلین مسئلہ معرفت ِخداوندی ہے کہ انسان اپنے رب کو پہچانے اور رب کو پہچان کر اپنے فطری جذبۂ تشکّر کو اُس کی ذات سے وابستہ

کردے۔ یہ فطری جذبۂ تشکّر نہ صرف انسان بلکہ حیوانات کا بھی خاصّہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ کوئی بھلائی کی جائے تو ایک خاص ردِّعمل ان کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے' جسے ہم جذبۂ شکر یا جذبۂ تشکّر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حیوان کے پاس اگرچہ وہ زبانِ نہیں ہے کہ جس میں وہ اس جذبہ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے محسن کی خدمت میں پیش کر سکے' لیکن اگر

آپ نے کبھی کسی بھوکے پیاسے حیوان کو کوئی غذا فراہم کی ہو یا پانی پلایا ہو تو اس کی آنکھوں سے یہ جذبہ تشکر اُبلتا ہوا آپ کو محسوس ہو گا۔ یہ گویا فطرت کا تقاضا ہے۔ حیوانات سے بلند تر سطح پر انسان ہے تو فطرتِ انسانی کا بڑا اساسی اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکر ادا کرے۔ جس نے بھی اس کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہو ' خیر کیا ہو' اس کی کوئی احتیاج پوری کی ہو' اس کی کوئی ضرورت پوری کی ہو تو وہ اس کا شکر بجالائے۔

مزید یہ کہ جب تک عقل انسانی اپنے اصل محسن اور مربی کو نہیں پہچانتی تو یہ فطری جذبۂ تشکّر یا تو منتشر رہتا ہے یا بھٹکتا رہتا ہے۔ چنانچہ آپ اگر شرک کی ساری تاریخ کا تجزیہ کریں گے تو بات یہی نظر آئے گی کہ اپنے علم و فہم کی کوتاہی کی وجہ سے لوگوں نے اس جذبۂ تشکّر کو مختلف اشیاء یا مظاہرِ قدرت کے ساتھ منسلک کر لیا۔ مثلاً یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ دنیا کے سارے نظام میں سورج کی حرارت کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ ہمارے پاس موجود ساری توانائیوں کی اصل بنیاد اور ذریعہ شمسی توانائی ہی ہے۔ اگر آپ لکڑی جلا کر آگ کے ذریعے سے حرارت حاصل کرتے ہیں تو یہ بھی درحقیقت سورج ہی کی حرارت تھی جو اس لکڑی میں جذب ہوئی اور اس نے وہ صورت اختیار کی۔ اسی طرح سورج کی حرارت ہی فصلوں کے پکنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لہٰذا انسان نے یہ سمجھا کہ ہمارا سب سے بڑا محسن یہ سورج ہی ہے اور نتیجتاً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے' اس کو سجدہ کیا' اسے معبود بنا لیا۔ اسی پر آپ قیاس کرتے چلے جایئے' جس جس چیز کے بارے میں احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ہماری کوئی بھلائی وابستہ ہے تو اس کے سامنے انسان جھک گیا اور اس کے اظہارِ تشکّر کے لیے اس نے مختلف مراسمِ عبودیت ایجاد کر لیے۔

حالانکہ عقل انسانی کی اصل معراج یہ ہے کہ وہ اپنے اصل مربی کو پہچانے اور اسے

اپنے اصل ربّ کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ جان لے کہ یہ تمام مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت' جنہیں نظامِ دنیا کے مختلف پہلوئوں سے وابستہ کیا گیا ہے' یہ سب خود کسی اور کی ربوبیت کے مظہر ہیں۔ کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق ہے' کوئی اور ہے جس نے ان کے لیے یہ سارا نظام بنایا ہے تو ایک ہی چھلانگ میں انسان وہاں پہنچتا ہے کہ اپنے اصل رب اور مربی کو پہچان کر اپنے پورے جذبہ تشکر کو اس کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔

یہ میں نے آپ کے سامنے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی اس پہلی آیت کا خلاصہ عرض کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کے حوالے سے حکمت اور حکمت کے منطقی اور لازمی نتیجہ کو بیان کیا ہے :

{وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾}

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر ادا کرو ! اور جو کوئی بھی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی بھلے کے لیے ۔ اور جو کوئی نا شکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔''

گویا فطرتِ سلیمہ کا اولین تقاضا اور عقل کی معراج اپنے اصل محسن اور مربی کو پہچان کر اس کا شکر

ادا کرنا ہے۔ اسی کا نام حکمت ہے۔ حکمت ‘عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیمہ کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے جس کا نتیجہ شکرِ ربّ یا معرفتِ ربّ ہے۔یوں سمجھئے کہ حکمت دین کا اساسی مسئلہ یہی ہے اور باقی سارے مسائل اب یہیں سے آگے چلیں گے۔

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ آیات کے ذریعے سے انسان کے اندر معرفتِ رب کو جگاتا ہے۔ میں نے جگانے کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ربّ کی معرفت فطرتِ انسانی میں بالقوہ (potentially) موجود ہے‘لیکن خوابیدہ (dormant) ہے اور انسان کے اندر سوئی ہوئی معرفتِ رب کو جگانے کا بڑا ذریعہ آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی ہیں‘جبکہ ان سے بھی زیادہ مؤثر ذریعہ آیاتِ قرآنیہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کہیں اپنے آپ کو ’الذکر‘ کہتا ہے‘کہیں ’ذکریٰ‘ اور کہیں ’تذکرہ‘ ۔گویا یہ تو صرف یاد دہانی ہے‘جبکہ معرفت۔

8

ربّ تو تمہارے اپنے اندر موجود تھی یا موجود ہے‘ لیکن تمہیں اس کا شعور نہ تھا۔وہ تمہارے شعور کی سطح پر نہیں آئی تھی‘ یا یہ کہ آئی تھی لیکن پھر تم اسے بھول گئے ہو اور تم پر ذہول کے پردے پڑ گئے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا کہ ’’کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے‘‘۔ تم گم ہو گئے ہو‘لہٰذا اس کو اُجاگر اور تازہ کرنے‘ گمشدگی کے اندھیروں سے نکال کر معرفت کی روشنی میں لانے کے لیے یہ آیاتِ مبارکہ ہیں: {ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ}(الحدید:۹) ’’(اللہ ہی)وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ روشن آیات نازل کی ہیں تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔‘‘

حصولِ معرفتِ ربّ کے بعد تین لازمی چیزیں

اب اس سے اگلے مرحلے پر چلتے ہیں جو اس وقت میری گفتگو کا اصل موضوع ہے۔ اس کے لیے یہ تمہید ضروری تھی کہ حکمت قرآن اور حکمت دین کا اوّلین‘ اہم ترین‘ سب سے اساسی اور بنیادی مسئلہ معرفتِ رب ہے۔ اگر اس مرحلے کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان طے کر لے‘بایں طور کہ اسے اللہ کی معرفت بھی حاصل ہو جائے اور اسے ایمان کی نعمت بھی میسّر آجائے تو اب اس کے سامنے تین مسئلے اور ہیں۔ ان کو اچھی طرح سے شناخت (identify) کر لیجیے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ معرفتِ ربّ سے اس کو جو فکرِ صحیح میسّر آئی ہے وہ مزید پیش قدمی کرے۔ یعنی ربّ کو پہچان لینا تو اس کا starting point تھا اور ابھی اس سے آگے بڑھ کر اس فکرِ صحیح نے بڑی بلندیوں کو چھونا ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں کلمہ طیّبہ کی مثال یوں بیان کی گئی ہے:{کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ } (ابراھیم) ’’جیسے ایک پاکیزہ درخت‘اس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں‘‘۔چنانچہ فکرِ انسانی کے

لیے مضبوط جڑ تو معرفت ِ ربّ ہے‘ لیکن اب یہ فکر ترقی کرے گی‘ نشوونما پائے گی‘ آگے بڑھے گی۔ اس کی شاخیں آسمانوں کی بلندیوں کو چھوئیں گی۔ تو سب سے پہلا مسئلہ ہے فکرِ صحیح کی مزید پیش قدمی !

9

دوسرا مسئلہ ہے عمل کی درستگی‘ صحیح صحیح عمل۔ یہ انسان کا بہت بنیادی مسئلہ ہے۔ انسان اپنے نفس امارہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مرعوب ہو کر کسی غلط رخ پر نہ پڑ جائے۔ چنانچہ اس کے عمل کو درست رکھنے کے لیے اسے کوئی سہارا درکار ہے۔

تیسرا مسئلہ تو میرے نزدیک اس دَور میں سب سے زیادہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے بہت سے دینی حلقے بھی ‘خاص طور پر جو Religious Activists شمار ہوتے ہیں‘ جو دین کی احیائی جدّوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں‘ تجدید ِدین‘ احیائے دین‘ غلبہ و اقامت ِدین کی بات کرتے ہیں‘ ان کی بھی بہت بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اس تیسرے گوشے کو تقریباً نظرانداز کر رہے ہیں اور وہ ہے روحانی ترقی۔ انسان کی اصل عظمت کی بنیاد تو وہ روحِ ربانی ہے جو اس میں پھونکی گئی :{وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ} (الحجر:۲۹) ۔اب بڑے سے بڑا عقلیت پسند (rationalist) اور روحانیات کا منکر شخص بھی کم از کم یہ ماننے پر مجبور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی ہے اس بیدر حقیقت انسانی روح کی عظمت اور اس کی شرافت‘ اس کی بلندی اور اس کی بزرگی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال معرفت رب حاصل ہوجانے کے بعد تین چیزیں ضروری ہیں:(۱)فکرِ صحیح کی ترقی (۲) عمل کی درستگی‘یعنی اس میں افراط وتفریط نہ ہو اور انسان نفس امارہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر کوئی غلط اور غیر متوازن راستہ اختیار نہ کرے۔ اور(۳) روحانی ترقی --------
اب ان تینوں چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:
(۱)فکرِ صحیح کی ترقّی: فکرِ صحیح کے مزید ارتقاء اور اس کی مزید پیش قدمی کے لیے قرآن حکیم نے سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں ’’ذکر‘‘ کو سب سے پہلے اور سب سے اہم عامل کی حیثیت سے شمار کیا ہے۔چنانچہ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں یہی مضمون آیا ہے:{ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾} ’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن اور رات کے اُلٹ

10

پھیر میں نشانیاں ہیں‘ ہوشمندوں کے لیے !‘‘ ان کے ذریعے سے انسانی شعور کے اندر معرفت ِربّ اُجاگر ہو گی۔ گویا اس نے وہ پہلا مرحلہ طے کر لیا‘ وہ dormant معرفت ِربّ activate ہو گئی۔ اب مزید فکر کا مرحلہ ہے جو اگلی آیت میں آیا ہے: {وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ}’’اور وہ غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں‘‘۔ لیکن اس تفکر کے ساتھ ذکر بھی ضروری ہے اور ذکر بھی وہ جو مستقل اور دائم ہو۔چنانچہ ’’اولوا الالباب‘‘ کی

صفت بیان کی گئی: {الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ} ''وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل (یعنی لیٹے ہوئے) بھی''۔ اب ان تین کے سوا تو کوئی پوزیشن انسان کی نہیں ہے اور اسی کا نام ہے دوامِ ذکر۔ اس کے ساتھ اگر وہ تفکر کرتے ہیں تو ان کا فکر اگلی منزل تک پہنچتا ہے۔
ذکر و فکر کی ایک دوسرے کے ساتھ لزومیت کو مولانا روم نے بہت ہی سادہ لیکن پر مغز انداز میں اپنے شعر میں بیان کیا ہے ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن !

یعنی اس قدر تو ہم نے تمہیں بتا دیا' سمجھا دیا 'یہ بات تو تمہاری عقل میں آ گئی ' اب جاؤ خود غور و فکر کرو اور مزید آگے پیش قدمی کرو۔ اور اگر فکر میں جمود آ جائے ' فکر سست پڑ جائے' تو جاؤ پھر ذکر کرو۔ گویا ذکر اور فکر گاڑی کے دو پہیے ہیں کہ جن سے فکر انسانی صحیح رخ پر آگے بڑھے گی۔ اگر یہ ذکر ساتھ نہیں رہے گا تو فکر انسانی کج ہو جائے گی اور پھر وہ فکر چاہے کتنی ہی بلندی کو پہنچ جائے لیکن وہ ٹیڑھی ہو گی اور وہ صراطِ مستقیم پر پیش قدمی کرنے والی فکر نہیں ہو گی۔
علامہ اقبال نے مولانا روم کو اپنا 'مرشد' تسلیم کیا ہے اور مولانا روم نے جو فکر اور خیال اپنے درج بالا شعر میں پیش کیا اسی کو علامہ اقبال نے دو اشعار میں مزید شکوہ کے ساتھ اور مزید خوبصورت اور حسین انداز میں پیش کیا ہے : ؎

جزبہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شہنشاہی است
فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جزبہ ذکر !

یعنی قرآن کے بغیر اگر کوئی شیر بھی ہو تو وہ بھی اصل میں لومڑی ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے' اس لیے کہ اصل شہنشاہی تو فقر قرآن ہے اور فقر قرآن اختلاطِ ذکر و فکر کا نام ہے۔ گویا فقر قرآن اس امتزاج سے وجود میں آتا ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو۔ اور آخری مصرع میں اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے فکر کو کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہوا نہیں پایا جب تک کہ اس کے ساتھ ذکر نہ ہو !

(۲) عمل کی درستگی: دوسری چیز ہے عمل کی درستگی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک گہرے تعلق کی ضرورت ہے۔ صبر کی بحث میں یہ مضامین میں نے کئی بار بیان کیے ہیں کہ جہاں مصیبت اور تکلیف پر صبر ہوتا ہے‘ وہیں اللہ کے احکام پر جمنا بھی صبر ہے‘ خواہشاتِ نفس کی باگ کو تھام کر رکھنا بھی صبر ہے اور استقامت یعنی کسی شے پر قائم رہنا بھی صبر کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ عمل صحیح پر استقامت اور اس پر صبر کی سب سے اہم بنیاد اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ اور سہارا تعلق مع اللہ ہے۔ جیسے فرمایا گیا: {وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ} (النحل:۱۲۷) ’’اور (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے‘‘۔ گویا صبر کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے ساتھ ایک ایسا تعلق برقرار رہے جو نہ صرف گہرا ہو بلکہ قائم و دائم اور مسلسل ہو۔ ذرا سا ذہول ہوگا‘ تعلق مع اللہ میں ذرا کمی آئے گی تو شیطان کا وار کاری ہو جائے گا۔ اسی کو حضور ﷺ نے حدیث میں تمثیلاً یوں تعبیر کیا ہے کہ اگر قلب یادِ خداوندی سے خالی ہو جائے تو ابلیس لعین اس پر اپنی تھوتھنی لگا کر پھونکیں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ فرمایا: ((اِنَّ اِبْلِیْسَ لَہٗ خُرْطُوْمٌ کَخُرْطُوْمِ الْکَلْبِ وَاضِعُہٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ آدَمَ))(رواہ الدیلمی‘ بحوالہ کنز العمال ۴/ ۲۶۹) ’’کتے کی تھوتھنی کی طرح ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے اور وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا

ہے‘‘۔ اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے‘ وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے‘ تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے۔ شیطان کو یہ موقع تب ملتا ہے جب انسان کے تعلق مع اللہ میں کمی ہو‘ یا تو وہ خانہ بالکل خالی ہو گیا ہو یا اتنا کمزور ہو گیا ہو کہ کالعدم ہو جائے۔ اس پر فارسی کا وہ مقولہ بھی ہے کہ ’’خانہ خالی را دیو می گیرد!‘‘ کہ اگر گھر خالی رہے تو جنات اس پر آکر قبضہ جما لیتے ہیں۔ گویا اگر انسان کا دل یادِ الٰہی سے خالی ہو تو اس پر شیطان قبضہ کر لیتا ہے۔

(۳) روحانی ترقّی: تیسری چیز ہے روحانی ترقی اور اس کے لیے ہماری دینی اصطلاح ہے: تقرب الی اللہ‘ یعنی اللہ سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جانا۔ اس پر میرا ایک کتابچہ بھی ہے: ’’تقرب الی اللہ کے دو مدارج‘‘ جو درحقیقت ایک حدیث نبوی علیہا الصلوۃ السلام پر مبنی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے تقرب الی اللہ کے لیے دو درجے بیان فرمائے‘ ایک درجہ ہے تقرب بالفرائض یعنی فرائض کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرنا اور دوسرا درجہ ہے تقرب بالنوافل یعنی نوافل کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرنا۔ ان دونوں درجوں میں کیا نسبت و تناسب ہے اور اہمیت کے اعتبار سے کون بڑھ کر ہے‘ یہ تمام باتیں میں نے اپنی اس تقریر میں بیان کی تھیں جو اس کتابچے میں شائع ہوئی ہے۔ جن حضرات کو شوق ہو وہ اس کا مطالعہ کریں۔

یہ تقرب کوئی جسمانی یا مادّی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ سے قرب حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ اور ہمارے درمیان کروڑوں میل کا فاصلہ ہے اور اب ہمیں کسی سیڑھی یا رسّی کے ذریعے بڑی محنت اور مشقّت سے اس فاصلے کو ختم کرنا ہے۔در حقیقت انسان اور اللہ ربّ العزت کے درمیان فصل اور بُعد تو ہے ہی نہیں‘جیسے قرآن مجید میں فرمایا گیا: {وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾}(قٓ)’’اور ہم تو انسان سے اُس کی رَگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں‘‘۔{وَ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ} (الحدید:۴) ’’اور وہ تو تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو‘‘۔بس معاملہ یہ ہے کہ تم اور چیزوں میں مشغول و مصروف رہتے ہو‘ تم ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیتے‘ ہماری طرف متوجہ ہی

نہیں ہوتے۔ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں‘کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے‘ راہروِ منزل ہی نہیں !

انسان جب متوجہ ہو جاتا ہے اور روحانی اعتبار سے آگے پیش قدمی کرتا ہے تو یہ درحقیقت تقرب الی اللہ ہے اوراسی کو ہم کہیں گے روحانی ترقی۔

معرفت ِ ربّ کے بعد حکمت ِدین کا اہم ستون:نما

آگے بڑھنے سے پہلے میری اب تک کی باتوں کی ترتیب کو ذہن میں قائم کیجیے۔ ہم یہاں سے چلے تھے کہ دین کے ساتھ اصل مناسبت فلسفے کی نہیں‘حکمت کی ہے اور حکمت ِ قرانی کا پہلا‘ اہم ترین اور بنیادی مسئلہ معرفت ِرب کا حصول ہے۔ اس کا نتیجہ شکر ِخداوندی ہے اور اس کا ذریعہ آیاتِ آفاقی‘آیاتِ انفسی اور سب سے بڑھ کر آیاتِ قرآنیہ ہیں‘ جو الذکر‘ذکریٰ اور تذکرہ ہے۔اس پہلے مرحلے کو اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے طے کرلے تو اب اس کے سامنے تین مسئلے ہیں:(۱)فکر کی صحیح رخ پر مزید پیش رفت۔ اس کے لیے ذکر اور فکر دونوں کا امتزاج لازمی ہے۔(۲) عمل کی درستگی۔ نہ افراط وتفریط ہو اور نہ عدم توازن ہو۔ نہ انسان نفس سے مغلوب ہو جائے‘نہ جذبات کی رو میں اندھا ہوجائے اور نہ ماحول سے متاثر ہو جائے‘بلکہ اس کا عمل صحیح رخ پر ہو۔اس مرحلے کے لیے تعلق مع اللہ ضروری ہے‘جتنا تعلق مع اللہ گہرا ہوگا اتنا ہی عمل درست ہوگا۔ (۳) روحانی ترقی ‘جو اصل حاصل اوراصل مقصود ہے اور اس کے لیے تقرب الی اللہ ضروری ہے۔

اب غور کیجیے کہ ان تینوں چیزوں کا نماز کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اورنماز ان تینوں کے لیے ستون کی حیثیت رکھتی ہے‘ لہٰذا ایمان یا معرفت ِربّ کے بعد حکمت ِدین کا اہم ترین مسئلہ نماز ہے‘اس لیے کہ یہ انسان کو

اللہ ربّ العزت کے ساتھ ایک گہرے تعلق کا ذریعہ فراہم کرتی ہے۔چنانچہ اپنی تمام مصروفیات جن میں گم ہونے کا خدشہ ہوتا ہے‘ان سے کچھ وقت نکالو۔ ۲۴ گھنٹے کے معمولات میں سے کم سے کم پانچ مرتبہ تو لازماً نکلو اور اپنے آپ کو‘ اپنے حواس اوراپنی باطنی کیفیات کو بھی ذرا تازہ کرو۔ اگر کوئی گندگی‘ نجاست یا

14

کسی اورطرح کی ناپاکی کا کوئی معاملہ ہے تو طہارت حاصل کرو‘اس لیے کہ طہارت سے تمہاری روح کو بھی بالیدگی حاصل ہو گی‘ تمہارے حواس بھی تازہ ہوں گے‘گویا بحیثیت کل تمہاری ہستی چاق و چوبند ہو جائے گی۔ جو بھی کسل‘ سستیاں اورکثافتیں ہیں ان سب سے نجات حاصل کرواوراپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاؤ۔ اس کے ساتھ اپنا عہد بھی تازہ کرواور اس کی اہم صفات کو بھی اپنے ذہن میں مستحضر کرو۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت میںآپ کے سامنےبیان کر چکا ہوں جس میں معرفت ِ ربّ اور جذبۂ تشکر کا بیان ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک سے روکا گیا ہے اور اسے ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے۔اس کے بعد درمیان میں کچھ اور مضامین آئے اور پھر یہ آیۂ مبارکہ آئی:

{یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَ اۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ انۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾ } (لقمٰن)

’’ اے میرے بچے ! نماز قائم کرواور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکواور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو ! یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

گویا اللہ کو محض پہچان لینا کافی نہیں ہے‘بلکہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ یاد رہے گا تو فکر صحیح آگے بڑھے گا اور پھراس سے تعلق مع اللہ بڑھے گا ‘اور جب اس کے ساتھ ایک گہرا تعلق قائم ہو گا تو عمل درست رہے گا ۔ بالکل یہی بات سورۂ طٰہٰ میں بیان ہوئی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے مکالمہ اور مخاطبہ کا تذکرہ ہے۔ گویا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہونے والی پہلی وحی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء کرام علیہم السلام کے گروہ میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام کیا ہے۔ اگرچہ حجاب کے پیچھے سے گفتگو ہوئی ہے‘ لیکن یہ کہ درمیان میں فرشتے کا واسطہ نہیں تھا۔ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا:{وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوۡسٰی تَکۡلِیۡمًا ﴿۱۶۴﴾}(النّساء) ’’اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام فرمایا ہے‘ جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے‘‘۔اس مکالمہ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

{اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾ } (طٰہٰ)

15

یہ آیت مبارکہ حکمت قرآنی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ ’’بے شک میں ہی اللہ ہوں‘میرے سوا کوئی معبود نہیں‘ پس میری بندگی کرو اور نماز کو قائم کرو میری یاد کے لیے‘‘۔

بلکہ اسی سلسلہ کلام میں--------کافی گفت و شنید کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ معذرت بھی لی‘ کچھ دعائیں بھی کیں اور ان میں سے ایک دعا اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی کہ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی کارِ رسالت میں شریک کردیا۔ اس کے بعد پھر جب فرعون کی طرف جانے کا کہا تو فرمایا: {اِذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ اَخُوۡکَ بِاٰیٰتِیۡ وَ لَا تَنِیَا فِیۡ ذِکۡرِیۡ ﴿۴۲﴾} (طٰہٰ) ’’جائو تم اور تمہارا بھائی میری ان نشانیوں کے ساتھ اور میرے ذکر سے سستی نہ کرنا‘‘۔ یہ جو عظیم مشن تمہارے کندھوں پر آگیا ہے اور یہ کٹھن فرض جو تم پر عائد ہو گیا ہے‘ اس کے لیے تمہارے پاس قوت کا بڑا ذریعہ نماز ہے‘ لہٰذا میری یاد میں کبھی غفلت نہ کرنا‘ اس میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دینا۔ اس لیے کہ اگر وہ تعلق کمزور پڑ جائے یا منقطع ہو جائے (معاذ اللہ!) تو پھر انسان گویا شیطان کے لیے ایک لقمہ تر بن جاتا ہے۔

اب آپ تیسری شے تقرب الی اللہ پر غور کیجیے۔ اس کے حوالے سے میں نے جو فرائض اور نوافل کی بات ہے‘ اس کو اس وقت ذہن سے نکال کر یہ سمجھئے کہ تقرب الی اللہ میں نماز کا کیا مقام ہے۔ اس لیے کہ نماز فرض بھی ہے اور نماز نفل بھی ہے‘ تو وہ ان دونوں مرحلوں میں شریک رہے گی۔ اب لفظ صلوٰۃ کے حوالے سے ان دونوں چیزوں کو سمجھئے۔ اس کا مادہ ہے: ’’ص ل و‘‘ یا ’’ص ل ی‘‘ اس لیے کہ حروفِ علت تو ایک دوسرے سے بدلتے رہتے ہیں۔ خالص عربی زبان میں اس مادہ کا مفہوم ہے: آگ جلانا‘ آگ تاپنا‘ آگ سینکنا یعنی حرارت حاصل کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہنم کے ذکر میں اِصۡلَوۡہَا‘ یَصۡلَوۡنَہَا‘ تَصۡلٰی نَارًا وغیرہ جیسے الفاظ بار بار آتے ہیں اور حضرت موسیٰ ؑ کے کلام میں تَصۡطَلُوۡنَ کا لفظ آیا ہے۔ جب وہ آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے اہل خانہ سے یہی کہا تھا: {سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡہَا بِخَبَرٍ اَوۡ اٰتِیۡکُمۡ بِشِہَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۷﴾} (النمل) ’’میں وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئوں گا‘

یا کوئی دہکتا ہوا انگارہ لے آئوں گا تاکہ تم (آگ) تاپ سکو‘‘--------- تَصۡطَلُوۡنَ درحقیقت باب افتعال ہے اور ت یہاں پر ص کی وجہ سے ط کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

بہرحال اس مادہ کا بنیادی مفہوم ہے: تاپنا‘ سکائی اور حرارت حاصل کرنا۔ اس کے حوالے سے سمجھ لیجیے کہ نماز کا بنیادی تعلق روح کے ساتھ ہے۔ روح میں محبتِ خداوندی کی آگ اگر ٹھنڈی پڑ گئی ہو یا اس میں کمی ہو رہی ہو تو اس کو ازسرنو چارج کرنا‘ جیسے بیٹری کو recharge کیا جاتا ہے‘ اسی طرح روح کے اندر محبت خداوندی کی اس حرارت کو ازسرنو تازہ کرنا‘ یہ ہے درحقیقت نماز کا اصل مقصد۔ اس لیے کہ اس لفظ کا اصل لغوی مفہوم یہی ہے۔ اگرچہ لفظ صلوٰۃ سب سے زیادہ جس معنی میں استعمال ہوتا ہے‘ وہ ہے اقدام کہ کسی کی طرف متوجہ ہونا اور

پھر دعا۔ صلوٰۃ کا سب سے قریبی لفظی مفہوم دعا ہے یعنی کسی کی طرف توجہ کرنا' مناجات کرنا' گفتگو کرنا' مخاطبہ' مکالمہ۔ دعا در حقیقت صلوٰۃ کا سب سے بڑا اصطلاحی مفہوم ہے' لیکن اس کے مادہ کا اصل مفہوم ہے تاپنا' حرارت حاصل کرنا۔ ان دونوں کے حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ وہ تاپنا اور حرارت حاصل کرنا روح کے اعتبار سے ہے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ: ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے !

یہ عشق کی آگ جب بجھ جاتی ہے تو در حقیقت یہی انسان کی روحانی موت ہے۔ مجھے اقبال کا ایک اور شعر یاد آیا۔ اقبال نے انسانِ محکوم اور انسانِ حر یعنی غلام اور آزاد انسان کی نفسیات کے بنیادی فرق کو یوں بیان کیا ہے ؎

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک !

یعنی انسان منطق کی دلیلوں میں چالاک ہو جائے 'لغت ہائے حجازی کا ایک خزانہ جمع کر لے کہ اسے تمام الفاظ کے معانی یاد ہوں' فقہ کے بڑے بڑے مسائل اسے ازبر ہوں' بے انتہا جزئیات مستحضر ہوں' فلسفے کے بڑے بڑے مسئلے اس نے حل کر لیے ہوں' لیکن اگر روح

میں اللہ کی محبت کی آگ نہیں ہے' وہ تپش نہیں ہے تو وہ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے !

اسی کے حوالے سے آج مجھے یاد آیا تھا کہ علامہ اقبال کی جو بڑی سادہ سی ایک نظم ہے: ''یا ربّ دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے ''اس میں جو الفاظ آئے ہیں ''جو روح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے'' یہ ہے نماز کا اصل مقصود اور یہی وہ چیز ہے جو آج نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ پہلو سامنے ہے ہی نہیں۔ اس کا دوسرا پہلو سامنے ہے اور وہ بھی میرے نزدیک بہت اہم اور بہت بنیادی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں 'لیکن یہ ہے بلند ترین منزل کہ نماز تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اور یہ اس لیے درکار ہے کہ روح کے اندر عشق کی حرارت اور گرمی تازہ ہو جائے ۔ بسا اوقات یہ اندر دب جاتی ہے جیسے آگ کے انگارے کے اوپر راکھ آجاتی ہے -------- ع

''آگ دبی ہوئی سمجھ 'آگ بجھی ہوئی نہ جان !''

--------اس دبی ہوئی آگ کو پھر ایک شعلہ بنانا‘پھر اس کے اندر ایک حیاتِ تازہ پیدا کرنا‘ یہ ہے نماز کا اہم ترین اور بلندترین مقصد۔

ذکر خطابی کی بلند ترین شکل: نماز

ذکر کا اصل مفہوم ہے: استحضار اللہ فی القلب۔ ہمارے ہاں ذرائع ذکر کو بھی غلطی سے ذکر قرار دے دیا گیا ہے۔ جیسے نماز ذکر نہیں ہے‘بلکہ ذکر کا ذریعہ ہے: {وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾}’’اور نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے‘‘۔یہ اللہ اللہ کہنا‘سبحان اللہ‘ الحمد للہ کا ورد‘ ادعیہ ماثورہ‘ حضور ﷺ کی مسنون دعائیں جنہیں انسان اپنے معمولاتِ دنیاوی کے ساتھ پڑھتا رہتا ہے‘ یہ تمام ذرائع ذکر ہیں۔ حقیقت میں ذکر ہے استحضار اللہ فی القلب یعنی اللہ کو دل میں لے آنا۔

اب اس کے حوالے سے ذرا بات سمجھ لیجیے۔ ایک تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ’’الذکر‘‘یعنی مجسم ذکر تو قرآن ہے۔ لہٰذا ذکر کی فہرست جب آپ مرتب کریں گے تو ان میں سب سے پہلے قرآن آئے گا‘ اس لیے کہ وہ ہماری حکمت کے پہلے مسئلے کو حل کر رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر ’ذکر‘ کی مختلف صورتیں اور اس کے لیے کچھ اصطلاحات ہیں جن کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

ایک ذکر غیابی ہے یعنی صیغہ غائب میں اللہ کو یاد کرنا‘مثلاً اللہ اکبر‘ اللہ اکبر کہنا۔ اللہ اکبر جملہ اسمیہ خبریہ ہے اور آپ ایک حقیقت کی تکرار کر رہے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے‘اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ درحقیقت ذکر غیابی ہے کہ آپ اس میں اللہ سے مخاطب نہیں۔ایک ذکر خطابی یا ذکر حضوری ہوتا ہے جس میں مکالمہ اور گفتگو ہوتی ہے۔ نماز درحقیقت ذکر حضوری اور ذکر خطابی کی بلند ترین شکل ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ نماز یا صلوٰۃ کے اکثر و بیشتر جو اصطلاحی معنی کیے جاتے ہیں وہ ہے دعا اور دعا میں مکالمہ اور مخاطبہ ہی ہوتا ہے۔ اے اللہ! اے میرے رب! اے میرے پروردگار! پھر نماز اور صلاۃ کا لفظ اقدام اور کسی کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بھی مستعمل ہے۔ افتتاحِ صلاۃ یعنی نماز شروع کرنے کے لیے ایک تو وہ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں آئے ہیں: {اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾} (الانعام)’’ میں نے تو اپنا رُخ کر لیا ہے یکسو ہو کر اُس ہستی کی طرف جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں‘‘۔یہ ہے توجہ کا ارتکاز‘ بشرطیکہ یہ صرف الفاظ ہی نہ ہوں‘بلکہ واقعتاً انسان کی یہ نفسیاتی کیفیت ہو کہ شعوری طور پر وہ فیصلہ کر رہا ہو کہ اب میں منقطع ہو رہا ہوں۔ ہر طرف سے اپنی توجہ کو ہٹا کر‘اپنے آپ کو خالی الذہن کر کے یعنی ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے میں اپنی توجہ کا ارتکاز کر رہا ہوں اُس ذاتِ اَقدس کی طرف جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور بالکل یکسو ہو کر

کر رہا ہوں۔

دوسری وہ دعا ہے جس سے ہم اپنی نماز کا افتتاح کرتے ہیں ۔ دیکھیں اس میں خطاب کا کس قدر اہتمام ہے: سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ ''پاک ہے تو اے ہمارے رب!'' وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ۔یہ ہے تخاطب' براہِ راست مخاطب ہونا۔ یہ گویا میں آپ کے سامنے علامہ اقبال کے خطبے کا لب لباب عرض کر رہا ہوں۔ ان کے مشہور خطبات میں غالباً تیسرا یا چوتھا لیکچر ہے: ''The meaning of prayer in Islam'' ۔ اس میں تصور یہ دیا گیا ہے کہ دو ہی انائیں ہیں۔ ایک انائے کبیر {اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا} یہ وہ انائے کبیر 'انائے مطلق ہے' جس کو علامہ اقبال نے کہا: The Big I Am ۔ اس

انائے کبیر کا بیان سورۂ طٰہٰ کی درج بالا آیت میں ہے اور میرے علم کی حد تک قرآن حکیم کا کوئی اور مقام نہیں ہے جس میں اللہ ربّ العزت نے اپنی انانیت کبریٰ اور انانیت مطلقہ کا اظہار اس قدر بلند آہنگ کے ساتھ کیا ہو۔ چنانچہ ایک طرف وہ انائے کبیر ہے اور ایک طرف یہ انائے صغیر' انائے محدود' چھوٹی سی ایک انا ہے۔ آپ جب کہتے ہیں ''میں'' تو بڑی محدود سی ایک انا ہے۔ گویا ایک طرف finite ego اور دوسری طرف Infinite Ego ہے' اور صلوٰۃ اصل میں اس چھوٹی انا کا بڑی انا کے سامنے آ کر' روبرو ہو کر خطاب ہے۔ ایک ہے صیغہ غائب میں تکرار یعنی سبحان اللہ' الحمد للہ' اللہ اکبر کا ورد! وہ بھی بہت اہم ہے اور اس کا اپنی جگہ پر فائدہ ہے' لیکن ہر شے کے درجے ہیں۔ اور اگر آپ ان درجوں کا لحاظ نہیں کریں گے تو غلط رخ پر پڑ جائیں گے۔ ع

''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!''

چنانچہ نماز اصل میں ذکر خطابی اور ذکر حضوری کی بلند ترین شکل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ میں ککی تکرار درحقیقت خطاب کا انداز ہے کہ براہِ راست گفتگو ہو رہی ہے۔ اس طرح کی تکرار آپ کو دعائے قنوت میں ملے گی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ' وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ' وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ' وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ' وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ' اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ' وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ' وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ' وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ' اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ

اَلصَّلاۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن

سب سے پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ذکر کی ایک شکل ہے ذکر غیابی اور دوسری ہے ذکرِ حضوری یا خطابی اور ذکر

حضوری یا ذکرِ خطابی کا بلند ترین ذریعہ نماز ہے۔ اس کو ایک پہلو سے اور سمجھ لیجیے۔ سورۃ الفاتحہ جسے ''الصلوٰۃ'' کہا گیا ہے اس میں تدریجاً ذکرِ غیاب سے ذکرِ حضور کی طرف پیش قدمی ہوتی ہے: {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿ ۱ ﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ﴿ ۲ ﴾ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ﴿ ۳ ﴾ }یہ ذکر غیابی ہے' ابھی خطاب نہیں آیا۔ یہ وہی جملہ اسمیہ ہے۔

''کل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ جو رحمٰن ہے' رحیم ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے''۔ اب آگے غیاب سے حضور کی طرف پیش قدمی ہے:{اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ؕ﴿ ۴ ﴾ اِہْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ﴿ ۵ ﴾ }۔ پہلے ایک معاہدہ' ایک اقرار' اعتراف اور وعدہ ہے اوراس کے بعد دعا اوراستدعا ہے۔ یہ ہے غیاب سے حضور کی طرف تدریجاً ارتقاء۔ صوفیائے کرام نماز کو اہل ایمان کی معراج قرار دیتے ہیں:''اَلصَّلَاۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ''۔ مخاطبہ الٰہی کا براہِ راست شرف حضور اکرم ﷺ کو معراج میں حاصل ہوا ہے اور ''التّحیّات'' کا سارا مکالمہ وہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو نوٹ کر لیجیے کہ باقی وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے ہوئی ہے یا کوئی الہام ہوا ہے یا حضور ﷺ کے قلب مبارک پر کوئی شے القا کی گئی ہے'لیکن جو مخاطبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دنیا ہی میں کوہِ طور کی بلندیوں پر حاصل ہوا ہے'یہ براہِ راست مخاطبہ حضور ﷺ کو معراج کی شب حاصل ہوا۔ اسی لیے نماز کو''معراج المؤمنین'' قرار دیا گیاکہ اس میں وہی براہِ راست مخاطبہ و مکالمہ اور وہی گفتگو ہو رہی ہے۔

اس کے ضمن میں وہ حدیثِ قدسی بھی یاد رہنی چاہیے جس کی مزید تفصیل حضور ﷺ نے بیان کی ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((یَقُوْلُ اللہُ تَعَالٰی:))''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''۔ ((قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ))''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے مابین نصف نصف تقسیم کر دیا ہے''۔ اب یہاں تک تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جملہ ہے اور اس سے آگے کا بیان حضور ﷺ کی جانب سے ہے۔ فرمایا: ((اِذَا قَالَ الْعَبْدُ {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ} قَالَ اللہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ.....))''جب بندہ کہتا ہے:{اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ} تو پروردگار کہتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری حمد کی''۔ جب بندہ کہتا ہے: {اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ} تو پروردگار کہتا ہے:((اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ))''میرے بندے نے میری ثناء کی''۔ جب بندہ کہتا ہے {مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ} تو اللہ فرماتا ہے : ((مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ))''میرے بندے نے میری بڑی بزرگی بیان کی''۔ پھر جب بندہ کہتا

ہے : {اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ} تو اللہ فرماتا ہے :((ھٰذَا بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَ عَبۡدِیۡ وَلِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ)) ''یہ ہے میرے اور میرے بندے کے درمیان ‘اور میرے بندے کے لیے ہے جو اُس نے طلب کیا''۔ اس لیے کہ اس میں طلب بھی ہے کہ ہم تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔

{اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ} فعل مضارع ہے اور اس میں زمانہ حال اور مستقبل دونوں طرح ترجمہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ ترجمہ یوں ہوگا :'' پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریںگے۔ اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے''۔ اگر حال میں اس کا ترجمہ کریں تو یہ اعتراف اور اظہارِ حال ہے۔ اللہ کرے کہ واقعتاً وہ صحیح اظہارِ حال ہو اور ہم واقعی اللہ کی بندگی کرتے ہوئے یہ کہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ورنہ اگر ہماری اصل صورتِ حال سے وہ مطابقت نہ رکھتا ہو تو پھر ایک طرح کا جھوٹ اورغلط بیانی ہو جائے گی۔اور اگر اس کا ترجمہ مستقبل میں کریں تو یہ ہے عہد اور وعدہ کہ مستقبل میں ہم تیری ہی بندگی کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے رہیں گے۔

اب اس کے بعد اگلی تین آیتوں میں وہ استدعا اور دعا ہے اور اس حدیث میں اس کو ایک ہی جملے میں لیا گیا ہے کہ جب بندہ کہتا ہے: {اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ ا لۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ} تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :((ھٰذَا لِعَبۡدِیۡ وَلِعَبۡدِیۡ مَا سَأَلَ)) ''یہ خالص میرے بندے کے لیے ہے‘ اور میرے بندے نے جو مانگا وہ میں نے عطا کیا''۔یعنی بندے نے ایک درخواست پیش کی ہے اور میں نے وہ درخواست قبول کرتے ہوئے اس کی مانگی ہوئی چیز اسے دے دی۔

یہ ہے اس کی تاثیر کا عالم‘ بشرطیکہ یہ سارا معاملہ شعور کے ساتھ ہو اورظاہر و باطن کے ساتھ قول اور فعل کی مطابقت بھی ہو تو اس کا اتنا اونچا مقام ہے کہ اِدھر ایک جملہ ادا ہوااور اُدھر اللہ کی طرف سےresponse مل گیا۔ گویا ؎

اَفلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر‘ اُٹھتے ہیں حجاب آخر!

نماز:ذکرِ لسانی اور ذکرِ عملی کا مجموعہ

اب اس سے آگے بڑھیے۔ذکر کی ایک اور شکل بھی ہے اور وہ ہے ذکر عملی۔ ہم نے کہا:''اللہ اکبر''کہ اللہ بہت بڑا ہے‘اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ ایک اعتبار سے ذکر غیابی اور دوسرے اعتبار سے ذکرِ لسانیہے اور اس کا ایک عملی مظہر (demonstration) بھی ہے۔ انسان زبان سے ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سیدھا سجدے میں گرجائے تو درحقیقت یہ اس اللہ اکبر کی تعمیل ہو رہی ہے۔ لہٰذا نماز میں ذکر غیابی بھی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کی پہلی تین

آیات اور بعد از فاتحہ آپ نماز میں کچھ نہ کچھ قرآن بھی پڑھیں گے تو یہ ذکر غیابی ہے۔ پھر یہ کہ نماز میں ذکر حضوری اور ذکر خطابی بھی ہے کہ آپ نے اللہ سے عہد و پیمان کیا' قول و قرار کیا' استدعا کی۔ اس کے ساتھ ہی ذکر عملی بھی ہے کہ اللہ کی تعظیم میں انسان جھکتا ہے۔ آپ اپنے کسی بزرگ سے جب ملاقات کرتے ہیں تو ذرا جھک کر سلام کرتے ہیں۔ زیادہ جھکنے کی تو اجازت نہیں ہے' لیکن یہ جو تھوڑا سا خم آتا ہے' یہ آپ کی اندرونی کیفیت کا اظہار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی فطرت میں جیسے شکر ہے ویسے اس قدر تعظیم بھی فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ آپ استاد کے سامنے آئیں گے تو تھوڑا سا خم کھائیں گے۔ آپ اپنے کسی بزرگ رشتہ دار سے ملیں گے تو تھوڑا سا خم لامحالہ ہو جائے گا۔ یہ درحقیقت آپ کے اس فکر کی عملی تعبیر' اس کا عملی مظہر ہے کہ آپ نے اس ہستی کی تعظیم کی ہے اور اس کی عظمت کا اقرار اور اعتراف کیا ہے۔

نماز میں بھی اللہ تعالیٰ کی عملی تعظیم ہے' جس میں پہلا درجہ رکوع ہے کہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر آپ جھک جائیں اور اس کے بعد اس تعظیم کا آخری درجہ سجدہ ہے جس میں انسان اپنی پیشانی زمین پر ٹکا دیتا ہے۔ اگر یہ شعور کے ساتھ ہوا ہے تو گویا اس نے اپنی انانیت سے کامل دستبرداری اختیار کر کے اپنے آپ کو اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو یوں تعبیر فرمایا کہ جب سجدہ کرو تو یوں محسوس کرو کہ تم نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ درحقیقت انسان کی انانیت' میری مرضی' میری خواہش' میری پسند' میری عقل' میری منطق' میری choice' میرا

اختیار' یہ سب چیزیں ہی درحقیقت ہمارے اندر موجود شیطنت کا مظہر ہیں۔ جب اس کو انسان حالت سجدہ میں اپنے ہاتھوں اپنے رب کے قدموں میں رکھ دیتا ہے تو اس وقت انسان سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ))(رواہ مسلم)'' بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے قریب ترین ہوتا ہے''۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ سجدہ واقعی سجدہ ہو۔ اس ضمن میں اقبال کا شعر بڑی صحیح تعبیر ہے ؎

وہ سجدہ' روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب !

یہ ہے اصل میں تعبیر ! ! سجدوں پر سجدے اور رکعتوں کے ڈھیر لگ گئے ہوں اور نمازِ عشاء کی پوری سترہ رکعتیں آپ نے ادا کی ہوں (آپ کو معلوم ہے کہ سترہ رکعتوں میں ۳۴ سجدے ہو گئے) لیکن اگر وہ کیفیت آپ کے ذہن کی' آپ کی نفسیات کی' آپ کے قلب اور آپ کے شعور کی صحیح صحیح عکاسی نہیں کر رہی ہے تو پھر اس نماز سے ثواب تو ملے

گا‘لیکن وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی کہ انسان اپنے رب کے قریب ترین ہوجائے۔

اس نماز پر ثواب کا نہ ملنا تو گویا ظلم ہو گا اور اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ثواب ملے گا‘ بشرطیکہ اس نماز میں کوئی ریاکاری نہ ہو۔اگر دوسروں کو دکھانے کے لیے کوئی نماز پڑھی گئی ہے تو یہ ریاکاری ہے جو درحقیقت زیرو کی مانند ہے ‘اور اس سے جو شے ضرب کھاتی ہے وہ زیرو ہو جاتی ہے۔ایک کروڑ کے عدد کو بھی آپ زیرو سے ضرب دیں گے تو وہ زیرو ہو جائے گا‘لہٰذا ریاکاری تو زیرو کر دینے والی شے ہے‘بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ شرک تک پہنچا دیتی ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہ احمد)

’’جس نے دکھاوے کی خاطر نماز پڑھی اُس نے شرک کیا‘جس نے دکھاوے کی خاطر روزہ رکھا اس نے شرک کیا ‘اور جس نے دکھاوے کی خاطر صدقہ وخیرات کیا

اس نے بھی شرک کیا۔‘‘

لیکن اگر ریاکاری اور کوئی بدنیتی نہیں ہے تو اس نماز کا اجر تو لازم ہے ‘اس لیے کہ اس نے کچھ نہ کچھ تو اپنا وقت قربان کیا ہے۔ لیکن یہ نماز وہ نماز نہیں ہے کہ جس کے ایک سجدے سے روحِ زمین کانپ جاتی تھی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور وہ جب اپنے گہرے شعور اور احساس کے ساتھ سربسجود ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے قریب ترین ہوجاتا ہے۔

خلاصہ گفتگو

میری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ اپنے ذہن میں ایک بار پھر سے تازہ کرلیں کہ میں نے تین چیزوں کے حوالے سے آپ کے سامنے باتیں رکھی ہیں: پہلی منزل تو معرفتِ ربّ کا حصول ہے اوراس کے حاصل ہوجانے کے بعد اب تین ضرورتیں ہیں:

(۱) فکر صحیح کی صحیح رخ پرمزید پیش قدمی۔ اس کے لیے جہاں فکر درکار ہے وہاں ذکر بھی درکار ہے اور اس ذکر کی جامع ترین صورت نماز ہے۔

(۲) انسان کے عمل کا درست رہنا۔قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں ایک شخص کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کا نام قرآن میں تو مذکور نہیں ہے‘لیکن تورات میں اس کا نام ’’بلعم بن باعورہ ‘‘مذکور ہے۔وہ بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ قرآن کے الفاظ ہیں: {اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا}کہ ہم نے اسے اپنی آیات عطا کی تھیں .....اور آگے فرمایا:{وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰہُ بِھَا وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ}(الاعراف:۱۷۶)’’اور ہم چاہتے تو اسے اور ترفع اور بلندی عطا کرتے‘لیکن وہ تو زمین ہی کی طرف دھنستا چلا گیا‘‘۔گویا کوئی ایک لغزش انسان کے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ذرا سا

عدم توازن اُس کے رُخ کو ٹیڑھا کر دے گا اور جب ایک دفعہ ٹیڑھ ہو گئی تو شروع میں تو زاویہ چاہے دس درجے کا ہی ہو‘ لیکن جیسے جیسے عمل کی پیش قدمی ہو گی تو فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا اور انحراف شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا ۔ چنانچہ اس عمل کی درستگی کے لیے تعلق مع اللہ لازم ہے اور تعلق مع اللہ کا بھی سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔

(۳) تیسری چیز روحانی بالیدگی اور روحانی ترقی ہے اور اس کے لیے تقرب الی اللہ

25

ضروری ہے ! اس اعتبار سے بھی کہ تقرب کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف ارتکازِ توجّہ ضروری ہے تو اس کا ذریعہ بھی نماز ہے:{اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾ } ۔اور پھر اس اعتبار سے بھی کہ اسی کے ذریعے عشق الٰہی کی بجھتی ہوئی چنگاری کو پھر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی محبت کی وہ حرارت جو راکھ میں دَب گئی ہو یا اس میں کچھ کمی آگئی ہے تو اس کو جھاڑ کر راکھ کو ہٹا کر ازسرِ نو ایک حرارت پیدا کرنا مقصود ہے۔یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ جس مادے سے ماخوذ ہے‘ اس کا بنیادی مفہوم یہی ہے:تاپنا‘ حرارت حاصل کرنا‘ آگ جلانا‘ آگ روشن کرنا۔

الغرض‘ فلسفۂ دین اور صحیح تر لفظ میں حکمت ِدین میں نماز کی اہمیت کے حوالے سے تو میری یہ گفتگو ہے۔ باقی یہ کہ نظامِ دین میں تین اعتبارات سے نماز کی اہمیت زیر بحث آئے گی۔ نظامِ دین میں سب سے پہلے انفرادی سیرت کی تعمیر‘ ثانیاً معاشرے کی تنظیم اور پھر اس کے علاوہ جو دو عنوانات طے کیے گئے ہیں کہ خادمانِ دین اور طالبانِ قرآن کو کس کس اعتبار سے نماز سے مدد ملتی ہے‘ تو ان چاروں موضوعات پر کل گفتگو ہوگی‘ ان شاء اللہ !

26

طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین

کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾} (العنکبوت)

{اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا ﴿۷۸﴾وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ۖ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ } (بنی اسراءیل)

گزشتہ سے پیوستہ

میری گزشتہ روز کی گفتگو فلسفہ دین کے حوالے سے نماز کی حقیقت اور حکمت پر مشتمل تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمت دین کا اوّلین مسئلہ معرفت ِرب ّ ہے اور اسی کو ہم ایمان باللہ کہتے ہیں۔ ایک ہے اللہ کو پہچاننا اور ایک ہے ماننا۔ محض ماننا تو اس وجہ سے بھی ہوجاتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تو جیسے اس کے والدین اللہ کو مانتے ہیں تو اسی طریقے سے وہ بھی ماننا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے لیے جو شرطِ لازم ہے وہ اس ماننے سے بھی پوری ہوجاتی ہے‘ لیکن اصل میں جو شے انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے‘ جسے قرآن ’’صبغۃ اللہ‘‘ سے تعبیر کرتا ہے‘ وہ ہے اللہ کو پہچاننا یعنی معرفت ِرب ّ!

میں نے عرض کیا تھا کہ معرفتِ ربّ کے لیے انسان کو صرف تذکر اور یاددہانی کی ضرورت ہے ‘اس لیے کہ یہ شے اصلاً فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اس کا شعور سویا ہوا ہے‘ خوابیدہ ہے‘ اسے بس activate کرنا ہے اور اس کے لیے ذریعہ ہے تذکر بالقرآن یعنی قرآن کے ذریعے سے یاددہانی حاصل کرنا۔

اس کے بعد انسان کے حکمتِ قرآنی اور حکمتِ دین کے دوسرے بڑے مسئلے کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا ۔ایک تو یہ کہ انسان کی فکر‘ اس کی سوچ‘ اس کا علم‘ اس کے نظریات اور افکار صحیح رخ پر پروان چڑھیں‘پیش قدمی کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فکر کے ساتھ ذکر بھی موجود رہے۔ اگر اس میں یک رخی آگئی تو کجی آجائے گی۔ مولانا روم اور علامہ اقبال کے اشعار کے حوالے سے میں اسے مزید واضح کرچکا ہوں ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن !

اور ؎

جزبہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شہنشاہی است !
فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جزبہ ذکر !

اس ذکر کا سب سے مؤثر‘ سب سے عمدہ‘ سب سے اعلیٰ اور سب سے جامع ذریعہ نماز ہے۔

دوسری ضرورت انسان کے عمل کے درست رہنے کی ہے‘بایں طور کہ عمل کج نہ ہوجائے‘ اس میں افراط و تفریط نہ ہو‘ عدم توازن نہ ہواور وہ سیدھے راستے پر گامزن رہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی تین اصطلاحات ہیں:(۱) صراطِ سوی‘ درمیانہ راستہ (۲)صراطِ مستقیم‘ سیدھا راستہ‘اور (۳)قصد السبیل‘ وہ راستہ جو انسان کو سیدھا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس راستے پر انسان کا قدم جما رہے اور وہ کہیں اِدھر اُدھر کی پگڈنڈیوں پر مڑ نہ جائے۔ نہ وہ نفس امارہ سے مرعوب یا مرغوب ہو‘ نہ ماحول کے غلط اثرات سے متاثر ہو اور نہ ہی جذبات کی کسی طوفانی رو کے اندر بہہ جائے۔

اس کے لیے مستقل‘ زندہ‘ بیدار‘ حقیقی تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے اور اس تعلق مع اللہ کا بھی سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے اعلیٰ وسیلہ نماز ہے۔

تیسری چیز جو میں نے عرض کی تھی وہ اصل میں ان سب کا مقصود ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک سطح پر آکر ذرائع کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں اور ان سب کا اپنا ایک ہدف اور مقصود ہے ۔اور وہ ہے انسان کی روحانی ترقی‘ جس کے لیے میں نے تقرب الی اللہ کی اصطلاح استعمال کی تھی یعنی اللہ سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جانا۔ پھر یہ قرب کوئی مادی مسئلہ نہیں ہے ‘اس لیے کہ اللہ ربّ العزت اور ہمارے درمیان کوئی زمانی یا مکانی فصل نہیں ہے‘ لیکن یہ کہ ذہول‘ عدم توجہ اور دوسری چیزوں میں دل لگ جانے کی وجہ سے دل میں محبت‘ خداوندی کے لیے جگہ نہیں رہتی اور یہ چیزیں انسان کو اپنے رب سے دور کر دیتی ہیں۔ ورنہ پروردگار کی طرف سے تو ہر وقت ایک دعوتِ عام ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں‘ کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے‘ رہروِ منزل ہی نہیں !

اس حوالے سے وہ حدیث قدسی بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:((وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً))(رواہ البخاری)’’اگر میرا بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہو تو میں ایک گز اس کے قریب ہوتا ہوں ‘اور اگر وہ مجھ سے ایک گز قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر قریب ہوتا ہوں ‘اور اگر وہ میری طرف چل کر آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں‘‘۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے تو ہر وقت دعوتِ عام ہے‘ جبکہ ذہول اور عدم توجہی ہماری طرف سے ہے۔ بہرحال اس توجہ الی اللہ اور تقرب الی اللہ کا بھی سب سے اعلیٰ‘ سب سے عمدہ‘ سب سے جامع طریقہ اور ذریعہ نماز ہے۔ یہ ہے میری کل کی گفتگو کا خلاصہ !

طلبِ قرآن کا مفہوم اور اس کی شرائط

اب آتے ہیں آج کے موضوع کی طرف یعنی ’’ طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے

لیے نماز کی خصوصی اہمیت‘‘ اور اس پر میں چند باتوں کا اضافہ بھی کرونگا ---------- سب سے پہلے یہ جانتے ہیں کہ طالبانِ قرآن سے کیا مراد ہے ؟طالب قرآن سے مراد ہے قرآن مجید سے علم صحیح‘ فہم صحیح اور ہدایت اخذ کرنے کا آرزومند۔ اس کے لیے ذرائع ہیں: قرآن کا پڑھنا‘ قرآن پر غور و فکر‘ سوچ بچار‘ تدبر۔ پھر یہ کہ طالب قرآن کا اصل ہدف

کیا ہے اور وہ قرآن سے کیا چاہتا ہے؟ معاذ اللہ‘ کوئی طالب قرآن ایسا بھی ہو سکتا ہے جو صرف اس لیے قرآن کو حفظ کر رہا ہو یا قرآن کو پڑھ رہا ہو کہ اُسے کوئی پیشہ اختیار کرنا ہے۔ اِس وقت اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ طلب قرآن سے اصل مراد ہے: قرآن سے ہدایت اخذ کرنا‘ قرآن کے ذریعے اپنے فکر کو جلا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے فکر اور سوچ بچار کی جو صلاحیتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں‘ ان کو صحیح رخ پر پروان چڑھانا۔ گویا بات وہی ہو گئی جو کل میں بیان کر چکا ہو کہ فکر انسانی کے صحیح رخ پر آگے بڑھنے اور پیش رفت کا معاملہ!

اب نوٹ کیجیے کہ اس ہدایت ِقرآنی اور صحیح علم و فکر ِقرآن سے مستفید ہونے کے لیے دو چیزیں شرطِ لازم ہیں: تصحیح نیّت : جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا کہ علم دین کے حصول کا ایک محرک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں خطیب بننا ہے‘ امام لگنا ہے۔ ہمارے ملک کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے تو چاہے کوئی حقیقی اسلامی نظام یہاں نافذ نہیں ہے‘ لیکن مساجد میں خطباء کے باقاعدہ گریڈز مقرر ہیں اور یہ بھی ایک مستقل پیشہ بن گیا ہے۔ بہت سے لوگ اب علم دین اس لیے حاصل کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے دنیوی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پیش نظر رہنا چاہیے: ((مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ يَصْرِفَ بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ))(رواہ الترمذی ومرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح) ’’جس نے علم دین اس غرض سے حاصل کیا تاکہ اس کے ذریعے علماء سے مقابلہ کرے گا یا اس کے ذریعے احمقوں سے حجت بازی کرے گا یا لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے نارِ جہنم میں داخل کرے گا۔‘‘

علم اور تحصیل ِعلم کی تو بڑی فضیلت اور بڑی اہمیت قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا: ((يُوْزَنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ وَدَمُ الشُّهَدَاءِ‘ فَيَرْجَحُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ عَلٰى دَمِ الشُّهَدَاءِ)) (اخرجہ الدیلمی فی مسند الفردوس) ’’روز قیامت علماء کے قلم کی سیاہی اور شہداء کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزنی ہو جائے گی۔‘‘

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ((تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ اِحْيَائِهَا))(رواہ الدارمی‘ باب مذاکرۃ العلم‘ روای: ابن عباس رضی اللہ عنہما) ’’رات میں ایک گھڑی پڑھنا پڑھانا ساری رات عبادت کرنے سے افضل ہے‘‘۔ یعنی ایک شخص ساری رات جاگتا ہے اور نوافل ادا کرتا ہے‘ اس کے مقابلے میں ایک شخص کچھ دیر علم کی تدریس یا تحصیل کرتا ہے تو یہ افضل ہے۔ اس علم کا یہ مقام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر علم حاصل کرنے کا مقصد یہ ہو کہ انسان علماء کی محفل میں بیٹھ سکے‘ ان کی اصطلاحات میں گفتگو کر سکے‘ یہ نہ محسوس ہو کہ یہ شخص ہمارے مابین بیٹھنے کے قابل نہیں ہے اور یہ ہماری

اصطلاحات سے واقف نہیں ہے‘ اس لیے کچھ چیزوں کا علم حاصل کرلیا جائے‘ یا مقصد یہ ہو کہ بے علم لوگوں پر انسان دھونس جما سکے‘ ان پر اپنے علم کا رعب گانٹھ سکے‘ یا پھر اپنے علم کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا مقصد ہو تو اس کے لیے شدید وعید ہے اور ایسا شخص اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا رہا ہے۔

اس کے برعکس ایک حدیث یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ))(رواہ الدارمی والطبرانی) ’’جس شخص کو موت آئی اس حال میں کہ وہ علم کی تحصیل کر رہا تھا تاکہ وہ اس کے ذریعے سے اسلام کو زندہ کرے تو ایسے شخص اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق رہ جائے گا‘‘۔ معلوم ہوا کہ طلب علم میں تصحیح نیت کی بڑی اساسی اہمیت ہے اور تصحیح نیت کے لیے لازم ہے دوامِ ذکر الٰہی اور دل کا اللہ کے ساتھ متعلق رہنا۔

31

مجھے یہاں حدیث کا ایک اور جملہ یاد آگیا ۔یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے سات افراد کا تذکرہ فرمایا جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن خاص اپنے سائے تلے جگہ دے گا‘ جس دن کسی کے لیے اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا‘ ان میں سے ایک شخص وہ بھی ہے:((وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي الْمَسَاجِدِ))(صحیح البخاری‘ کتاب الاذان‘ باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ) ’’وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں ہی اٹکا رہتا ہے‘‘۔ وہ اگرچہ اپنی ضروریات‘ معاش کی بھاگ دوڑ اور دوسری ذمہ داریوں کے لیے باہر نکلتا ہے‘ لیکن دل وہیں اٹکا رہتا ہے کہ جیسے ہی اذان کی آواز آتی ہے تو فوراً مسجد کی طرف لپکتا ہے۔ جیسے مچھلی کو اگر آپ پانی سے نکالیں گے تو تڑپے گی‘ اسی طرح ایک حقیقی مسلمان کا مسجد سے باہر والا وقت ماہیٔ بے آب والی کیفیت میں گزرتا ہے۔

اس ضمن میں یاد رکھیں کہ دل اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ معلق نہ رہے‘ جڑا نہ رہے تو نیت میں فساد آجائے گا۔ نیت میں فساد کے لیے شیطان دل میں پھونکیں مارنے لگتا ہے اور ذکر سے خالی قلب کے بارے میں یہ حدیث کل میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید سے صحیح فکر‘ صحیح علم‘ صحیح سوچ اور حقیقی ہدایت کے اخذ کرنے کے لیے تصحیح نیت شرطِ لازم ہے اور اس کے لیے لازم ہے دوامِ ذکر اور دوامِ ذکر کا سب سے اعلیٰ‘ سب سے عمدہ اور سب سے جامع طریقہ نماز ہے۔

کل میں نے ذکر کی اقسام بتائی تھیں: ذکر غیابی‘ ذکر حضوری‘ پھر ایک ذکر صرف ذہنی و فکری ہے اور اس کے ساتھ ایک ذکر وہ ہے جس میں عمل کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ذکر کے یہ جملہ پہلو نماز میں جمع ہو گئے‘ چنانچہ نماز ذکر غیابی بھی ہے‘ ذکر حضوری بھی ہے‘ خطاب بھی ہے‘ دعا بھی ہے‘ مخاطبہ و مکالمہ بھی ہے اور ہم کلامی بھی ہے۔ اسی لیے نماز کو مؤمنین کی معراج کہا گیا ہے۔مزید یہ کہ اس میں نہ صرف ہم ذکر لسانی کر رہے ہوتے ہیں‘ بلکہ رکوع اور سجود کے ذریعے عملاً ہم اللہ کی تعظیم بھی کر رہے ہوتے ہیں۔

اب تک کی میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ طالبِ قرآن یعنی صحیح معنی میں قرآن کی ہدایت سے استفادہ کے لیے شرطِ اوّل ‘جو شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے‘وہ ہے تصحیحِ نیت۔

اس کے لیے ضروری ہے دوامِ ذکر اور ذکر کا جامع ترین‘ بلند ترین طریقہ اور ذریعہ نماز ہے۔
(۲)علم کے ساتھ عمل بھی: طالب قرآن کے لیے ایک دوسری شرط بھی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ جیسے جیسے علم و ہدایت حاصل ہو‘ اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی فوراً شروع ہوجائے۔ ایک بات سمجھ میں آگئی‘ ذہن پر منکشف ہو گئی ‘دل نے گواہی دے دی کہ ہاں بات ٹھیک ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے !

میری فطرت یہی کہہ رہی ہے اور مجھے اپنے اندر سے بھی اسی بات کی گواہی مل رہی ہے‘گویا ذہن اور قلب کا متفقہ فیصلہ ہو چکا کہ یہ صحیح ہے تو اب فوری طور پر عمل اس رخ پر مڑے۔ اوراگر انسان پہلے سے ہی اس پر عامل ہے تو مزید انشراح و انبساط ہو گا‘ اس پر مزید اعتماد پیدا ہو گا‘مزید اطمینان حاصل ہو گا۔یہی وہ لفظ ہے جو نفس انسانی کی بلند ترین کیفیت کے لیے آیا ہے :
{یٰٓاَیَّتُہَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ﴿۲۸﴾ }(الفجر)
’’اے نفسِ مطمئنہ ! اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اُس سے راضی‘ وہ تم سے راضی۔‘‘
چنانچہ اگر پہلے سے اس پر عامل ہے تو مزید اطمینان اورانشراح پیدا ہو گا اوراگر نہیں ہے تو اب اس کی طرف رخ کو موڑنا لازم ہے۔ یہ نہیں کریں گے تو وہی فصل(gap) شروع ہوجائے گا: {لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ }(الصف)’’کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟‘‘یہاں سے جو فصل شروع ہوگا --------اسے انسان کے فکر و عمل کا فاصلہ کہہ لیجیے‘ علم و عمل کا فصل کہہ لیجیے یا قول و فعل کا تضاد کہہ لیجیے --------یہی آگے بڑھ کروہ روگ اور مرض بن جائے گا جس کی طرف قرآن بار بار نشان دہی کرتا ہے :{فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ } (البقرۃ:۱۰)’’اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے تو اللہ نے ان کے روگ

میں اضافہ کر دیا‘‘۔پھر یہی روگ ترقی کر کے انسان کو اس مقام تک لے جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا اور صریحاً کفر سے بھی زیادہ مبغوض اور ناپسند ہے ‘اور وہ ہے نفاق۔

دوامِ صلاۃ اور نمازِ فجر

اب عمل کے لیے بھی تعلق مع اللہ لازم ہے اور اس کا ذریعہ وہی ذکر دوام ہے جس کی بلند ترین اور جامع ترین صورت نماز ہے۔ ابتدا میں مَیں نے سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیات تلاوت کی تھیں جن میں اسی کی طرف اشارہ ہے: {اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ} ''نماز کو قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے سے لے کر رات کے گہرے ہوجانے تک اور قرآن کا پڑھا جانا فجر کے وقت''۔ یہ ہے دوامِ صلاۃ۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کیجیے کہ نماز کو قائم رکھو {لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ} سورج جب نصف النہار پر ہو کر ذرا سا مغرب کی طرف ڈھل جائے تو یہ اس کا دلک ہے' دُلُوکِ الشَّمْس اور جب سورج غروب ہوگیا اور اس کے بعد رات تاریک ہو گئی' پھر تاریکی کا پردہ خوب گہرا دبیز ہو گیا تو یہ غَسَقِ الَّیْل ہے۔یہاں سے وہاں تک تو نماز کو قائم رکھنا ہے۔ اس کی کچھ نہ کچھ کیفیت ذاتی طور پر انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے ۔ خاص طور پر سردیوں کے موسم میں جب دن چھوٹے ہوتے ہیں' بایں طور کہ ذرا سا سورج ڈھلا ہے تو ظہر' بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزرے گا تو عصر' پھر ایک یا سوا ایک گھنٹہ گزرا تو مغرب' پھر گھنٹہ' ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد عشاء کا وقت ہوجاتا ہے۔

اس صورتِ حال میں جو شخص واقعتاً نماز کا پابند ہو تو اس کے لیے مسجد کی طرف مسلسل آمد و رفت ہے' گویا وہ نماز ہی میں ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی ایک نماز کے دوران سلام پھیرتے ہیں اور پھر نماز شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً ظہر کی نماز میں آپ نے چار رکعات سُنّتِ مؤکدہ ادا کر کے سلام پھیر لیا تو اب آپ نماز میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد پھر آپ جماعت میں چار رکعات فرض کے لیے کھڑے ہوئے تو پھر نماز میں آ گئے۔ اس کے بعد پھر سلام پھر گیا تو اب آپ نماز میں نہیں ہیں' لیکن ساتھ ہی آپ دو رکعت سُنّتِ مؤکدہ ادا کرنے کے لیے پھر نماز میں آ گئے۔ درحقیقت یہ پوری نمازِ ظہر ہے' جس میں آپ نماز

سے نکل کر بھی نماز میں ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے وقفے وقفے سے مسجد سے نکلنا تو ہے' لیکن بعینہٖ اسی تشبیہہ کو سامنے رکھیں تو گویا نماز مسلسل قائم ہو رہی ہے دُلُوکِ الشَّمس سے لے کر غَسَقِ الَّیل تک۔

اس کے بعد خاص طور پر فجر کی نماز کا علیحدہ سے تذکرہ کیا گیا ہے' اس لیے کہ اس میں طولِ قنوت یعنی زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اور لمبی قراءت ہوتی ہے ۔یہ گویا نمازِ فجر کے لوازم میں سے ہیں' اسی لیے آیت زیر مطالعہ میں ''وَصَلٰوۃ الفجر'' نہیں بلکہ ''وَقُرْاٰنَ الْفَجْر'' کہا گیا کہ ''التزام رکھو فجر میں قرآن کا''۔ یعنی فجر میں قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے' زیادہ سے زیادہ اس کی تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا۔

آیت کے آخر میں فرمایا: {اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا ﴿۷۸﴾} ''یقیناً فجر کے وقت قرآن کا پڑھا جانا مشہود ہے''۔ مَشْہُوْدًا کے بارے میں کئی تفصیلی اقوال ہیں۔ مشہود کے ایک معنی یہ ہیں کہ قلب حاضر ہوتا

ہے‘استحضار ہوتا ہے ‘ طبیعت تروتازہ ہوتی ہے‘تکان نہیں ہوتی‘ کسل نہیں ہوتا۔ رات بھر آپ نے نیند لی ہے تواب آپ تروتازہ ہیں‘آپ کے تمام قوائے باطنی اور اندرونی صلاحیتیں مکمل بیدار ہیں اور وہ وقت گویا قرآن میں موجود چیزوں کے استقبال(reception)کے لیے بہترین اور سازگار ماحول ہے۔ مشہود کے حوالے سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ فجر کی نماز میں وہ فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی رات کے وقت ہوتی ہے----- ابھی off ہونے سے پہلے انہیں فجر کی نماز بھی ساتھ پڑھنی ہے ------اور وہ فرشتے جنہوں نے دن کا چارج سنبھالنا ہے‘ وہ بھی پہلے آجاتے ہیں تاکہ فجر کی جماعت میں شریک ہوسکیں۔

بہرحال یہ مشہود کے مختلف اقوال ہیں‘ لیکن میں اس وقت توجہ دلا رہا ہوں کہ طالب ِ قرآن کے لیے دو شرطیں ہیں: تصحیح نیت اور علم اور عمل میں کسی فرق و تفاوت یا تضاد کا پیدا نہ ہونا۔ان دونوں کے لیے لازمی ہے دوام ذکر اوراس کا اہم ترین وسیلہ اورذریعہ نماز ہے۔ اب اس کے ساتھ جوڑیے اُس پہلی بات کو جو کل مینے کہی تھی اور آج بھی اسے دہرایا کہ معرفت ِرب کے لیے سب سے بڑا ذریعہ ذکر ِ مجسم ہے اور وہ قرآن ہے۔اس اعتبار

سے گویا نمازِ فجر کا پروگرام دو آتشہ ہو گیا۔ اب یہ صرف صلاۃ نہیں ہے‘بلکہ اس کے ساتھ قرآن کو بھی جوڑ دیا گیا ہے جو مجسم ذکر ہے اور جو معرفت ِ ربّ کا سب سے جامع اور بلند ذریعہ ہے۔

اگلی آیت میں اس سے اگلی منزل کا بیان ہے۔آیت زیر مطالعہ میں تو فرض نمازوں کا ذکر آگیا ‘یعنی ظہر سے عشاء تک اور پھر فجر اور اب اگلی آیت میں اس سے اگلی منزل یعنی نوافل کا بیان ہے: {وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ۫} ’’اور رات کے ایک حصے میں بھی جاگا کرو اس (قرآن) کے ساتھ‘یہ اضافی چیز ہے آپؐ کے لیے‘‘۔یعنی یہ جو فجر کا پروگرام ہے‘اس کو دو آتشہ سے سہ آتشہ اگر کرنا چاہتے ہو تو اب رات کے ایک حصے میں اپنے آرام میں سے لٹوتی کرو اور اُس وقت خاموشی سے اور پرسکون انداز میں ربّ کے حضور کھڑے رہو۔اس وقت نہ کوئی دیکھنے والا ہے اورنہ کسی طرح کی کوئی خلل اندازی (disturbance)ہے۔ براہِ راست بندے اور ربّ کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسی فجر کی کیفیت کو دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ کر کے اس سے استفادہ کرو۔

اس سب کا حاصل اقبال کے اس شعر میں ہے : ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

جب یہ قرآن کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو اس کے اندر تبدیلی آجاتی ہے ۔اندرونی کیفیات‘ اندرونی احساسات‘ اندرونی میلانات‘ اندرونی رجحانات -------- انہی کو ہم کہیں گے اقدار (values) -------- میں

انقلاب آجاتا ہے۔ اور جب یہ انقلاب اندر سے آئے تو پھر یہ نہایت محکم‘ نہایت پائیدار اور پرتاثیر ہوتا ہے کہ ایک فرد کے انقلاب سے ایک عالمی انقلاب کا پراسیس شروع(inishiate)ہو سکتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے‘ دیے سے دیا روشن ہوتا ہے‘ اسی طریقے سے ایک شخص کے اندر یہ کامل انقلاب انقلابی پراسیس کو inishiate کر دے گا۔ تو علامہ اقبال کے الفاظ ’’جہاں دیگر شود‘‘ کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تو اُس شخص کے لیے زمین و آسمان بدل گئے۔ پہلے کچھ اور نظریات تھے اب کچھ

اور نظریات ہیں‘ پہلے نقطہ نظر اور تھا اب اور ہے۔یعنی اس شخص کی پوری دنیا بدل گئی اوردوسرا یہ کہ اس دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے عمل کا بھی آغاز ہو گیا۔

خدمت ِدین کا مفہوم

اب آیئے آج کے عنوان کے دوسرے حصے کی طرف کہ خادمانِ دین کے لیے نماز کی کیا اہمیت ہے۔ یہاں بھی پہلے ہمیں define کرنا ہوگا کہ خادمانِ دین سے مراد کیا ہے اور خدمت دین کسے کہتے ہیں؟ ایک تو ہم اپنے بوڑھے والدین کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے جو مولانا روم نے بات کو سمجھانے کے لیے حکایت کے پیرائے میں لکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کہیں سے گزر رہے تھے توانہوں نے ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ جنگل بیابان میں تنہائی میں مناجات کر رہا تھا ‘اللہ سے ہم کلام تھا کہ اے ربّ ! اگر تو میرے سامنے آ جائے تو میں تیرے پائوں دھوئوں‘ تیرے پائوں دبائوں‘تیرے سر میں سے جوئیں نکالوں‘تیرا سر دھوئوں۔ اس کے ذہن میں خدمت کا یہی تصور تھا۔ اس کا کوئی بزرگ ‘ بوڑھی والدہ‘بوڑھا والد یا کوئی چودھری ہو گا جو اس سے یہ خدمتیں لیتا ہو گا تو اس کے ذہن میں خدمت کا یہی ایک تصور تھا۔چنانچہ اپنے اس محدود ذہن میں وہ یہی چیزیں اللہ کو آفر کر رہا تھا۔اس پر مجھے اقبال کا وہ شعر یاد آرہا ہے کہ ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں !

یہ ایک جذبہ ہے کہ اللہ سامنے ہو تو ہم کیا کریں گے۔ ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچے گا کہ وہ کیا کرے گا۔اس غریب چرواہے نے بھی اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوچا کہ اگر اللہ اس کے سامنے ہو گا تو وہ یہ کام کرے گا۔اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے ڈانٹ دیا کہ یہ کیا کفر بک رہے ہو ! اب وہ ایک خاص کیفیت میں تھا‘ حضرت موسیٰ کی بات سن کر اس نے چیخ ماری‘ کپڑے پھاڑے اور نکل گیا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت

موسیٰ ؑسے فرمایا : اے موسیٰ تو نے یہ کیا کیا' میرا یہ بندہ اپنے ذہن کے مطابق مجھ سے ہم کلام تھا' تم نے ہمارا یہ تعلق توڑ دیا !

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی !

ہم نے تمہیں لوگوں کو ہم سے جوڑنے کے لیے بھیجا ہے' نہ کہ کاٹنے کے لیے۔

بہرحال یہ بات اس لیے یاد آگئی کہ خدمت دین کا کیا مقام ہے اور ہم اللہ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں' اللہ کے رسول ﷺ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں اور اللہ کے دین کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خدمت کے لیے لفظ ''نصرت''قرآن مجید میں آیا ہے :{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ}(الصف:۱۴) ''اے اہلِ ایمان ! اللہ کے مددگار بن جائو' جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے کہا تھا حواریوں سے کہ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنے؟''اسی طرح سورۃ الحدید میں فرمایا: { وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ }(آیت ۱۵)''اور اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں (اس کے وفادار بندے) جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں غیب میں ہونے کے باوجود''۔چنانچہ نصرتِ خدا و رسولؐ تو قرآن کی اصطلاح ہے۔

نصرتِ خدا اور نصرتِ رسولؐ کا مفہوم

اب دیکھتے ہیں کہ نصرتِ خدا اور نصرتِ رسولؐ سے کیا مراد ہے؟یہ سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسی کا نام ہو گا خدمتِ دین۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ طالب قرآن کے لیے دو شرطیں ہیں: تصحیح نیت اور علم و عمل کے اندر توافق' ہم آہنگی۔ اسی طرح خدمت دین کے بھی دو درجے ہیں۔

(۱)دعوتِ دین:اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا'سوئے ہوئوں کو جگانا' نیند کے ماتوں کو ہوشیار کرنا' بھولے اور بھٹکے ہوئے راہی کو نشاندہی کر کے صحیح راستے کی طرف بلانا۔ یہ ہے دعوتِ دین اور اللہ کے راستے کی طرف بلانا۔ سورۃ النحل میں فرمایا: {اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ}(آیت ۱۲۵) ''بلائو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان

سے بحث لیجیے بہت اچھے طریقے سے ''۔ کہیں مجادلہ اور جھگڑا بھی کرنا پڑ جائے تو وہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں ہونا چاہیے۔ کچھ ضدی آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ مناظرہ اور مجادلہ کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے' لیکن اس موقع پر بھی تمہارا طرزِ عمل نہایت عمدہ اور اچھا ہونا چاہیے۔یہ دعوتِ دین' خدمت ِدین کی پہلی منزل ہے۔

(۲)اقامتِ دین:خدمت ِدین کی دوسری منزل اقامت ِدین ہے یعنی دین کو قائم کرنا۔ اسی کو ہم آج کل ایک نئی اصطلاح کے حوالے سے تعبیر کر رہے ہیں: اسلامی انقلاب' یعنی پورے نظام کو بدل دینا۔ اس وقت کے نظام میں جو جو کجی ہے' اللہ سے دوری ہے' دین سے بُعد ہے' ظلم ہے' ناانصافیاں ہیں' استحصال ہے' ان سب کا قلع قمع کر کے 'جیسے ایک فرد اللہ کا بندہ بن جائے ایسا ہی پورا نظام اللہ کی بندگی میں آجائے۔ یہ ہے اقامت ِدین اور اس کے لیے جدّوجُہد' محنت' جان اور مال کا کھپانا' جہاد بالمال والنفس یا انفاقِ مال اور بذلِ نفس ضروری ہے۔

اب یہ اصطلاحات ہیں۔جہاد کے معنی کشاکش اور رسّہ کشی کے ہیں۔ ایک طرف وہ ہیں جو باطل کے علمبردار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ باطل نظام یہاں پر قائم رہے' یا کوئی اور ہیں جو کسی اور باطل کے پیروکار ہیں اوروہ چاہتے ہیں کہ وہ باطل نظام یہاں بھی آجائے۔ مثلاً اگر جاگیرداری اور سرمایہ داری کا باطل نظام چل رہا ہے تو خارج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو ملیامیٹ کر کے کمیونزم کا باطل نظام لانا چاہتے ہیں ۔تو دو قوتیں ہو گئیں۔ ایک وہ جو status quo برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ جو نظام رائج ہے وہی رہے۔جاگیردار اور سرمایہ دار تو یہی چاہیں گے کہ نظام بالکل نہ بدلے' جیسا ہے ویسا ہی رہے' اس لیے کہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ انہیں وہاں مراعات ملی ہوئی ہیں' ان کی حیثیتیں ہیں۔اسی طرح جہاں قبائلی نظام ہے وہاں قبائلی سردار کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ چنانچہ ایک قوت تو وہ ہے جو چاہتی ہے کہ نظام برقرار رہے اور وہ قوت ہر اس قوت کے مقابلے میں نبردآزما ہوجاتی ہے جو کسی نوعیت کی بھی تبدیلی لانا چاہے۔ پھر یہ کہ تبدیلی کا بھی ایک دوسرا نقطہ نظر موجود ہے۔ کمیونزم ہے' اس کے ماننے والے' اس کے چاہنے والے' اس

کے لیے محنت کرنے والے' جدّوجُہد کرنے والے بھی میدان میں ہیں۔اس صورتِ حال میں جو اللہ کے چاہنے والے' اللہ کے دین کے ماننے والے' اللہ کے دیے ہوئے نظام کو برپا کرنے کی جدّوجُہد کریں گے' تو رسہ کشی ہو گی' کشاکش ہو کر رہے گی۔

اس کشاکش کے لیے قرآن مجید نے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔پہلی جہاد ہے اور جہاد میں دو چیزیں کھپیں گی' جان اور مال ۔تو اس حوالے سے پہلی اصطلاح ہوئی:جہاد بالمال والنفس ۔دوسری اصطلاح ہے انفاق' اور انفاق کے معنی ہیں: کھپا دینا' خرچ کر دینا۔ اب اس میں بھی دو چیزیں ہیں۔جان کا کھپانا اور مال کا کھپانا۔تو اب اصطلاح یوں بنے گی: انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔

خدمت ِدین کے لیے صبر و مصابرت لازم

چنانچہ خدمت دین سے مراد ہے جہاد اور انفاق ‘اور اس کے لیے لازم ہے مسلسل جدّوجُہد‘مسلسل لشاکش‘ مسلسل کشمکش‘ مسلسل قربانی‘ مسلسل مقابلہ۔اس کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح ہے: صبر و مصابرت۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں فرمایا: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾ ٪} ’’اے اہل ِایمان ! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو۔اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ‘‘۔خود صبر کرو‘ڈٹے رہو‘ جمے رہو‘ہر نوع کی مخالفت کو جھیلو‘تکالیف کو برداشت کرو‘جو مصیبت آئے اُسے جھیلو اور جو قربانی دینی پڑے دو۔یہ ہے صبر و مصابرت --------صَابِرُوۡا باب مفاعلہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ تمہارے مقابلے میں تمہاری مخالف قوتیں جو صبر کر رہی ہیں ‘ان کے صبر پر بازی لے جاؤ۔ تمہارے مخالف بھی تو صبر کر رہے ہیں۔ابوجہل نے بھی گردن کٹوائی کہ نہیں کٹوائی؟ اپنے باطل دین اور باطل عقائد کے لیے چڑھ کر کے آئے کہ نہیں آئے؟ اب اگر تمہارا صبر ان کے صبر سے بڑھ کر نہیں ہو گا یا تمہارا صبر ان کے صبر کو مات نہیں دے گا تو تمہاری بازی مات ہو جائے گی۔اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو کچھ اصولوں پر بنایا ہے۔ اس کی خصوصی نصرت اور مدد اسی وقت آتی ہے جب اس کے بندے ثابت کر دیں کہ انہوں نے اپنا سب کچھ لگا دیا‘کھپا دیا

اور انہوں نے کسی چیز کو بچا کر نہیں رکھا ؎

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے‘ ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں !

اگر لوگ یہ ثابت کر دیں تو پھر اللہ کی نصرت آتی ہے۔سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:{مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾} ’’کب آئے گی اللہ کی مدد؟آگاہ ہو جاؤ‘یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔‘‘

صبر و مصابرت کا جامع ذریعہ: نماز

آیت زیر مطالعہ میں اصطلاح استعمال ہوئی:صبر و مصابرت‘ اور اس کو اگر ایک لفظ میں ادا کریں تو وہ ہے:استقامت یعنی کھڑے رہنا‘ ڈٹے رہنا‘ جمے رہنا۔ اب سوال یہ ہے کہ صبر کہاں سے ملتا ہے اور استقامت کے لیے source of strength کیا ہے ؟تو اس کے لیے قرآن مجید میں دو مرتبہ وہی بات آئی ہے کہ اس کا جامع ترین ذریعہ نماز ہے۔

بنی اسرائیل سابقہ اُمّت ِمسلمہ تھی‘انہیں معزول کر دیا گیا اور مسلمان اُمت ِمسلمہ کے منصب پر فائز

ہوئے۔پھر بنی اسرائیل کا قبلہ منسوخ ہوا اور کعبہ اُمت ِمسلمہ کا مرکز اور قبلہ قرار پایا۔اب معزول ہونے والی اُمت میں سے کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن میں حق کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت باقی تھی۔ایک تو ان سے خطاب کیا گیا ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں۔پہلے مثبت انداز میں دعوت ہے اور آگے پھر تنقید شروع ہو جاتی ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں' تمہاری یہ بداعمالیاں ہیں۔دعوت کا آغاز ہوتا ہے: {یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ وَ اِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾} ''اے بنی اسرائیل ! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تاکہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔اور صرف مجھ ہی سے ڈرو'' --------سورۃ المائدۃ کے شروع میں اہل ایمان کو بھی ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ} ''اے ایمان والو ! اپنے عہد کو پورا کرو'' --------لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک نئی نبوت اور ایک نئی رسالت کو تسلیم

کر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا ۔بنی اسرائیل میں تعصّب پیدا ہو چکا تھا' عصبیت پیدا ہو چکی تھی' اپنی برتری کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ اب ایک اُمّی قوم میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو کھڑا کر دیا تو ان کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج اور مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔اس کو آسان بنانے کے لیے اس رکوع کے آخر میں فرمایا: {وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ} ''اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے''۔ گویا یہ صبر اور صلاۃ جڑے ہوئے اور باہم لازم و ملزوم (inseparable) ہیں۔ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد تقریباً چودہ رکوعوں میں بنی اسرائیل پر بہت ہی طویل فردِ قرارداد ِجرم عائد کی گئی جس کی وجہ سے وہ اس منصب ِجلیلہ سے معزول کیے گئے۔ پھر بات آتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور پھر تحویل ِقبلہ کی۔ اور اس کے بعد اب نئی اُمت جو اس منصب پر فائز ہوئی ہے' اس سے خطاب آغاز ہوا اور اس کے شروع میں ہی فرمایا گیا: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾} ''اے ایمان والو ! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔جان لو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔یہاں اہل ِایمان سے بھی وہی بات بیان ہوئی جو پہلے بنی اسرائیل سے بیان ہو چکی تھی' اس لیے کہ دین تو ایک ہی ہے۔ دین کی بنیادی تعلیمات ایک ہیں' دین کی حکمت ایک ہے'بس دین کے ظاہری اعمال کی صورتوں میں کچھ فرق واقع ہوا ہے۔ نماز کی شکل بنی اسرائیل میں کچھ اور تھی اور اب ہمارے ہاں کچھ اور ہے۔ لیکن جہاں تک حکمت' فلسفے' دین کے مقاصد' دین کی اساسات' دین کی فکری بنیادوں کا تعلق ہے تو یہ ایک ہی ہیں اور دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے ۔

اس کے علاوہ میں نے ابتدا میں سورۃ العنکبوت کی ۴۵ویں آیت تلاوت کی تھی:

{اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾}

سورۃ العنکبوت سن ۵ نبوی میں نازل ہوئی ہے ۔یوں سمجھئے کہ جب حضور اکرم ﷺ پر وحی شروع ہوئی تو وہاں سے نبوت کا پہلا سال شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تقریباً تیرہویں سال

42

میں جا کر ہجرت ہوئی تو وہاں سے سن ہجری شروع ہو گا ‘جو اب ۱۴۱۰ھ ہے۔ یوں سمجھئے کہ آج سے ۱۴۱۸ قمری برس پہلے یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی۔یہ وقت وہ تھا جب مکہ میں اہل ایمان کو شدید مصائب ‘تشدد اور تعذیب سے سابقہ تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُری طرح مارا جا رہا تھا۔بالخصوص ایک تو وہ نوجوان جو اپنے بزرگوں کے رحم و کرم پر تھے اور دوسرے غلام جو اُن کی ملکیت تھے ‘ان کے ساتھ تو وہ جو چاہیں کر گزریں۔ اپنی اولاد کو بھی وہ تشدد و تعذیب کا نشانہ بنا رہے تھے‘ لیکن غلاموں کو تو وہ ہلاک کر دیتے تھے۔ جیسے ابوجہل نے حضرت یاسر اور ان کی اہلیہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما دونوں کو بے دردی سے شہید کر دیا۔یہ جو شدید دور تھا جس میں صبر و مصابرت کی بڑی سخت ضرورت تھی اور اہل ایمان کے صبر کا بڑا عظیم امتحان تھا‘اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ان کیفیات میں صبر و مصابرت کے لیے تمہارا سہارا‘تمہارے لیے ذریعہ قوت (source of strength)اور اوّلین ہدایت یہ ہے: {اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ} ’’پڑھو اُس کو جو نازل کی گئی تمہاری طرف کتاب(یعنی قرآن) اور نماز کو قائم کرو‘‘۔دیکھئے یہ وہی بات ہو گئی کہ قرآن اور نماز کو جب یکجا کر دیا جائے تو اب یہ دو آتشہ ہو گئے۔ ایک طرف مجسم ذکر قرآن ہے تو اس کے ساتھ ذکر الٰہی کا بلند اور جامع ترین ذریعہ نماز ہے۔ جیسے ماقبل بیان کردہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات میں تھا:

{اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾ وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ۫ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾}

البتہ یہاں ترتیب اس کے برعکس ہے۔وہاں پہلے نماز کا ذکر ہے اس کے بعد قرآن کا‘جبکہ یہاں پہلے قرآن کا ذکر ہے اور بعد میں نماز کا۔

سورۃ العنکبوت کی زیر مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا:{وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ} ’’اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے‘‘۔ {وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾}’’اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو!‘‘

43

کل میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اور آج جس کا خلاصہ میں نے آغاز میں دہرایا ہے‘یہ گویا نہایت جامع الفاظ میں اللہ کی طرف سے اس کی تعبیر ہے کہ اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے۔ اس لیے کہ حکمت کا پہلا مرحلہ معرفتِ ربّ ہے اور

اس کے لیے تذکر بالقرآن ضروری ہے۔ اس کا دوسرا مرحلہ فکر صحیح کی طرف پیش قدمی اور عمل صحیح کا برقرار رہنا اور روحانی ترقی ہے۔اس کے لیے بھی دوامِ ذکر ضروری ہے اور ذکر کی بلند ترین اور جامع ترین صورت نماز ہے۔

اب ہم اپنی گفتگو کی طرف واپس چلتے ہیں کہ خدمت دین کے دو درجے ہیں: دعوتِ دین اور اقامتِ دین یا اسلامی انقلاب یا دین کے غلبے کی جدّوجُہد۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر صبر و مصابرت اور تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے‘ جس کا ذریعہ نماز اور قرآن ہے اور جہاں یہ دونوں جمع ہو جائیں تو وہ نورٌ علیٰ نور ہے۔

تعمیر سیرت و کردار میں نماز کی اہمیت

اب تک کی میری گفتگو آج کے عنوان کے حوالے سے تھی‘ اب آگے چلتے ہیں اور یہ میری گفتگو کا آخری حصہ ہے۔ انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر میں نماز کی کیا اہمیت ہے‘ اس ضمن میں سورۃ العنکبوت کی زیر مطالعہ آیت میں فرمایا گیا:{اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ؕ} ’’یقیناً نماز بے حیائی کے کاموں سے اور منکر (یعنی بدی کے کاموں) سے روکنے والی شے ہے‘‘۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ نماز ہو‘ محض ایک رسم نہ ہو ؎

رہ گئی رسمِ اذاں‘ روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا‘ تلقینِ غزالی نہ رہی !

اگر وہ نماز شعور کے ساتھ ہے‘ اپنی تمام باطنی کیفیات کے ساتھ ہے‘ اپنی تمام ظاہری قیود اور آداب کے ساتھ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا:{تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ؕ}۔ گویا انسان کی ذاتی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے بھی نماز سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر‘ جسے علامہ اقبال نے ’’تعمیرِ خودی‘‘ سے تعبیر کیا ہے‘ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو پروگرام دیا ہے اس کی

اساسات میں نماز کو حصار اور فصیل کی حیثیت حاصل ہے۔آگے بڑھنے سے پہلے لفظ اساسات کو سمجھئے۔ آپ نے ایک مکان بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ اس کی بنیادیں بھرتے ہیں اور یہ بنیاد ہی معیّن کرتی ہے کہ مکان کا نقشہ کیا ہو گا اور مکان کتنا مضبوط ہو گا۔ جس طرز کی آپ نے بنیاد رکھی ہے آپ عمارت بھی اُسی طرز کی بنا سکتے ہیں‘ اُس سے مختلف نہیں۔ گویا نقشہ تو اب وہی رہے گا جو بنیاد میں پڑ گیا اور عمارت کی مضبوطی کے لیے بھی اَوّلین اور اہم ترین شے بنیاد کی مضبوطی ہے ۔ چنانچہ تعمیر سیرت کے لیے جو پروگرام قرآن نے دیا ہے اور اس کی اساس میں جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تجویز فرمائی ہیں‘ ان میں گویا حصار اور فصیل کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔

سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے قرآن مجید کے دو مقامات ہمارے منتخب نصاب میں موجودہیں اور یہاں میں ان دونوں اسباق کی طرف صرف اشارہ کر رہا ہوں۔پہلا مقام ہے سورۃ المؤمنون کا پہلا رکوع :{قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ صَلَاتِہِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ }''کامیاب ہو گئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع اختیار کرنے والے ہیں'' اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کا احساس رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے اوصاف بیان کر کے اَخیر میں پھر فرمایا:{وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾ }''اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی (پوری طرح) حفاظت کرتے ہیں''۔ پہلے نماز کے باطن کی طرف اشارہ ہے کہ باطنی کیفیت خشوع و خضوع والی ہو اور پھر نماز کے نظام کی طرف اشارہ ہے۔بہرحال معلوم ہوا کہ انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے پورے پروگرام کا اول و آخر نماز ہے۔

یہ مضمون اور زیادہ نکھر کر آیا ہے سورۃ المعارج میں جہاں انسان کو ایک کچی شے سے تعبیر کیا گیا ہے جسے پکانا مقصود ہے :{اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾ }کہ انسان اپنی خلقت اور سرشت کے اعتبار سے تھڑدلا،کمزور اور کم ہمت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے: {اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾ وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾ }کہ جب کوئی تکلیف آتی ہے تو چیختا چلاتا ہے، نالہ و شیون اور فریاد کرتا ہے۔یعنی اس میں تحمل نہیں ہے، برداشت نہیں ہے،

جھیلنے کی صلاحیت اور استعداد نہیں ہے۔ اور اگر کچھ مال و دولت مل گیا تو پھر بڑا روک روک کر رکھتا ہے،بخیل بن جاتا ہے، تاکہ کسی اور کو اس مال سے کوئی فائدہ نہ پہنچ جائے۔ یہ ہے انسان کا تھڑدلا پن اور یہ اس کے سرشت، اس کی خِلقت اور اس کی طبیعت کے اعتبار سے اس میں خامی ہے ۔ اس خامی کو پختہ کرنے کا نام تعمیر سیرت ہے۔ بقول علامہ اقبال : ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تُو

اس خام ہی کو پختہ کرنا مقصود ہے، اس زرِخام کو ہی اب سونا بنانا ہے۔چنانچہ یہاں بھی تعمیرِ سیرت یا تعمیرِ خودی یا انسانی شخصیت کی پختگی (maturity)اور استحکام کے پروگرام میں سب سے پہلے نماز کا ذکر ہے۔گویا قرآن مجید کی رو سے اس تھڑدلے پن سے نجات پانے والے یہ لوگ ہیں:{اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾ } ''سوائے نمازیوں کے،جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں'' --------یہاں ایک ضمنی بات بھی نوٹ کرلیجیے کہ عربی میں مُصَلِّیْ کا معنی ہے: نماز پڑھنے والا۔ یہ ہمارے پنجاب کے دیہات کا ''مصلی'' نہیں ہے، جسے

نہایت درجہ استحقار سے دیکھا جاتا ہے۔ مُصَلِّی تو بہت بڑی صفت ہے -------- قرآن مجید کی رو سے اس تھڑدلے پن سے نجات صرف وہ لوگ پا سکتے ہیں جو اپنی نمازوں پر مداومت اور پابندی کرتے ہیں۔ یہاں سے بات چلی تو پھر اختتام بھی اسی پر ہوا: {وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِکَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ }''اور وہ لوگ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزازو اکرام ہو گا'' -- -------تو پہلی بات نوٹ کرلیجیے کہ تعمیرِ سیرت' تعمیرِ شخصیت 'تعمیرِ خودی' انسان کی شخصیت کا پختہ ہونا' اس مس خام کا سونا بننا' اس کا سارا دار و مدار جس پروگرام پر ہے اس کا اول و آخر نماز ہے۔ گویا اس پورے پروگرام کو اگر ہم ایک شہر سے تعبیر دیں تو شہر کی فصیل نماز ہے۔

اقامتِ صلاۃ اور نظامِ اوقاتِ صلاۃ

اب آیئے دوسری بات کی طرف کہ قرآن مجید میں نماز ادا کرنے یا نماز پڑھنے کا ذکر

کہیں نہیں ہے' بلکہ اقامتِ صلاۃ یعنی نماز قائم کرنے کا ذکر ہے۔گویا نماز صرف ایک انفرادی شے کی حیثیت سے فرض نہیںکی گئی' بلکہ اس کا ایک اجتماعی نظام بنایا گیا ہے اوراسی لیے قرآن میں ہر جگہ نمازکو قائم کرنے کا حکم ہے۔ اس قائم کرنے کے دو پہلو ہو جائیں گے۔ ایک خالص انفرادی ہے کہ جو فرد نماز کے لیے کھڑا ہے اس میں خشوع وخضوع ہو' حضوری کی کیفیت ہو' استحضارِ قلب ہو۔دوسرا پہلو اجتماعیت اور نظامِ صلاۃ سے متعلق ہے 'جس کے لیے محافظت اور مداومت کا حکم سورۃ المؤمنون میں بھی آیا اور سورۃ المعارج میں بھی۔یہ جو نظامِ صلاۃ ہے درحقیقت اسی پر ہمارے دین کا پورا نظام کھڑا ہے' بلکہ یوں کہیے کہ اسی کی ایک پروجیکشن ' اسی کی ایک توسیع 'اسی کی ایک ایکسٹینشن ہے۔ یہ مرکزی اہمیت ہے اقامتِ صلاۃ کو پورے دین کے نظام میں۔ پھر یہ کہ اجتماعی نظام میں بھی اصل شے تو افراد ہی ہیں ؎

اَفراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

اور اس ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیںکہ افراد کی تعمیر سیرت کے لیے اصل اساس نماز ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات جمع کر لیجیے کہ افراد کے دن بھر کے معمولات اور نظام الاوقات کو یہ نظامِ صلاۃ جکڑ لیتا ہے' مجال ہے کہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ نمازِ فجر کے لیے بیدار ہونے والا آدمی سارا دن کس قدر چاق و چوبند رہے گا۔ یہ نہیں کہ صبح کو جب تک چاہا سوتے رہے ۔ یہ تو مغربی اقوام کا شیوہ اورجدید تہذیب کا خاصہ ہے کہ ان کی رات نصف شب کے بعد شروع ہوتی ہے اور طلوعِ آفتاب کس شے کا نام ہے' وہ انہیں معلوم ہی نہیں۔ لیکن نظامِ صلاۃکی پابندی کے لیے

طلوعِ آفتاب سے کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آپ اُٹھیں گے تو فجر کی نماز باجماعت ادا کر سکیں گے۔ گویا نظامِ صلاۃ نے آپ کو طلوعِ فجر کے ساتھ جکڑ دیا اور اس سے آپ دن بھر active رہیں گے۔ پھر ظہر' عصر' مغرب اور عشاء اپنے اپنے وقت میں ادا کریں گے۔

یہاں یہ بھی دیکھئے کہ نمازِ فجر اور ظہر میں تقریباً سات آٹھ گھنٹے کا وقفہ ہے۔ اس کی

حکمت اللہ نے یہ رکھی ہے کہ انسان کی معاشی ضروریات بھی ہیں' اسے کسی دفتر جانا ہے' اُسے دوکان پر جانا ہے' اس کی کوئی اور ذمہ داری ہے جو اس نے ادا کرنی ہے' اس کے لیے ایک وقفہ رکھ دیا ہے جو تقریباً سات آٹھ گھنٹے کے مساوی بن جاتا ہے جس میں کوئی نماز فرض نہیں کی۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے ' اس لیے اس کے اندر ساری حکمتیں ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ انسان کی کیا ضرورتیں ہیں' اس کے کیا حوائج ہیں' اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے فجر سے ظہر تک کوئی فرض نماز نہیں ہے ۔ اگرچہ درمیان میں نفل نمازیں آجاتی ہیں' مثلاً طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد ''اشراق'' اور پھر ''صلاۃ الضحیٰ'' جسے عام مفہوم میں چاشت کی نماز کہا جاتا ہے۔ اس کے وقت کے بارے میں یوں سمجھئے کہ جیسے نصف النہار کے بعد ظہر ہے' اسی طرح اس سے کچھ پہلے یہ صلاۃ الضحیٰ ہے۔ اگر کسی شخص کے لیے ممکن ہو تو وہ ضرور ادا کرے ' اس کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ لیکن فجر سے ظہر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی فرض نماز نہیں رکھی' البتہ اس کے بعد تو نماز ہی نماز ہے۔ گویا مسلسل آنا جانا ہے۔ ذرا سا بھی آپ غافل ہو جائیں گے تو نماز باجماعت نکل جائے گی۔ اب آپ وہ نماز انفرادی طور پر ادا کریں گے یا آپ قضا کر کے بعد میں پڑھ لیں گے' لیکن ان دونوں صورتوں میں نماز باجماعت اور اقامتِ نماز کا تصوّر فوت ہو گیا اور اب وہ فضیلت کسی طور سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یوں سمجھئے کہ فرد کی زندگی اور اس کے نظام الاوقات کو جکڑ لینے والی شے اور اس میں بیداری' ہوشیاری اور چوکسی کو برقرار رکھنے والی سب سے بڑی شے نماز ہے۔

اجتماعیت میں نماز کی اہمیت

اب اس سے آگے آیئے۔ اجتماعیت کی پہلی اینٹ یہ ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں ہے' اس کی علامت معیّن ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے جو بڑے طویل مباحث ہیں' ان کو اس وقت مَیں نہیں چھیڑ رہا' بلکہ اسلامی معاشرے میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کی لازمی علامت کی بات کر رہا ہوں (لازمی شرط نہیں !) واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کی لازمی علامت اقامتِ صلاۃ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ نبویؐ میں کٹر منافقین کو بھی باجماعت نماز پڑھنی پڑھتی تھی' اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں

شمار کرانا چاہتے تھے۔ اسی کو حضور ﷺ نے ایک حدیث میں یوں فرمایا: ((بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِیْمَانِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ)) (سنن الترمذی، کتاب الاِیمان، باب ما جاء فی ترک الصلاۃ) ''کفر اور ایمان کے درمیان فرق کرنے والی شے نماز ہے''۔ گویا اجتماعیت کے لیے بھی جو اساس بن رہی ہے اس کے اندر اہم ترین شے نماز ہے۔

نوٹ کر لیجیے کہ میں یہاں قانونی زبان میں بات نہیں کر رہا اور نماز کو مسلمان ہونے کی شرطِ لازم نہیں کہہ رہا۔ چنانچہ ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا ہے تو اُس کو ہم کافر نہیں کہیں گے۔ البتہ اسلامی نظام ہوگا تو اسے سزا دی جائے گی۔ بعض فقہاء کے نزدیک تو تارکِ صلاۃ کا قتل بھی جائز ہے' بلکہ قتل کر دینا واجب ہے' جبکہ امام ابو حنیفہ ؒ کے ہاں سب سے زیادہ نرمی ہے اور وہ بھی یہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے والے کو قید کر دو اور اُس وقت تک رہا نہ کرو جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا عہد نہ کرے۔ بے نمازی کی تعزیر میں تو فقہاء کا اختلاف ہے' البتہ منکرِ صلاۃ سب کے نزدیک کافر ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ افراد کی تعمیرِ سیرت کا اساسی پتھر (foundation stone) نماز ہے۔ پھر افراد کے نظام الاوقات کو جکڑنے والی ' انہیں بیدار اور چوکس رکھنے والی شے اقامتِ صلاۃ اور نظامِ اوقاتِ صلاۃ ہے۔ دوسری بات یہ کہ افراد جب معاشرے کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کی بھی سب سے بڑی علامت' سب سے بڑا شعار نماز ہے۔

مساواتِ انسانی کا عظیم مظہر: نماز

اب تیسری چیز دیکھئے۔ اسلام اور اسلامی معاشرے کا ایک بہت بڑا امتیازی وصف ''مساوات'' ہے جس کی عظمت کا اقرار کفار نے بھی کیا ہے' دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ ایچ جی ویلز جیسا شخص' جسے حضور ﷺ سے بڑی ہی عداوت تھی' بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا کہ:

''اگرچہ انسانی حریت' مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری (حضرت مسیحd کی جائے ولادت ناصرہ گاؤں تھا' اس لیے آپؑ مسیح ناصری کہلاتے ہیں)

کے ہاں بھی بہت سے مواعظِ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

اس مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا مظاہرہ اقامتِ صلاۃ کے موقع پر ہوتا ہے۔ گورنر آئے یا صدرِ مملکت اُسے اسی صف میں شامل ہونا ہوگا اور اس کا چپڑاسی بھی کندھے سے کندھا ملا کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گا۔ یہ تو ہمارے ہاں غلط حرکتیں ہوتی ہیں کہ کچھ جگہ مخصوص کر لی اور وہاں گورنر صاحب کھڑے ہوگئے اور دائیں بائیں

بڑے بڑے افسر کھڑے ہوگئے۔ اسلامی نظام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسجد میں جگہ محفوظ (reserve) کرنا آداب کے خلاف ہے۔ نماز میں صف بندی کے حوالے سے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!

کوئی پشتینی رئیس ہو یا کوئی پشتینی عالم یا کوئی بہت بڑا صوفی ہو اور کوئی چمار جس نے ابھی کلمہ پڑھا ہو' یہ دونوں ایک صف کے اندر کندھے سے کندھا ملا کر برابر کھڑے ہوں گے۔ ان میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہوگا۔

بہرحال مساوات ہمارا سب سے اعلیٰ وصف ہے اور دنیا اگر تأثر قبول کرے گی تو ان چیزوں سے کرے گی جو ان کے ہاں نہیں ہیں۔ ان کے ہاں رنگ اور نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ ہے' فرق و تفاوت ہے اور اس فرق کو ختم کرنے کے لیے انہیں کتنے جہاد کرنے پڑے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے امریکہ کو یہ فرق ختم کرنے کے لیے کتنی بڑی سول وار لڑنی پڑی ہے۔ اس کے باوجود وہ فرق و تفاوت آج بھی قائم ہے' گورے اور کالے کے درمیان کوئی محبت نہیں پیدا ہو سکی اور دلوں کے اندر بُعد ابھی بھی باقی ہے۔ جبکہ یہاں مساوات کا دور دورہ ہے اور اس کا سب سے بڑا مظہر نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُم)) (صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب تسویۃ الصفوف واقامتھا...) ''برابر ہو جاؤ اور بے ترتیب نہ ہو' ورنہ تمہارے دلوں میں بھی نا اتفاقی آجائے

گی''۔ گویا یہ صف بندی کے آداب میں سے ہے کہ کندھے سے کندھا ملا ہونا چاہیے اور جڑ کر کھڑے ہونا چاہیے' اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دل جڑ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فصل در حقیقت اندر کا فصل ہے اور اس کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑا ہوا جائے۔ چنانچہ مساوات جو اسلامی معاشرے کی ایک بہت نمایاں اور امتیازی خصوصیت ہے' اس کا سب سے بڑا مظہر اور اس کا سب سے بڑا مظاہرہ اقامتِ صلاۃ کے ذریعے سے ہے۔ پھر اسی کے ذریعے سے معاشرے کی تنظیم ہے۔

لوگوں کی تنظیم کا ذریعہ: نماز

واقعہ یہ ہے کہ ہم غور نہیں کرتے‘ سوچتے نہیں‘ وہ بات دوسری ہے‘ لیکن ذرا غور کریں کہ اجتماعی نظام میںنماز کی کتنی مرکزی اور محوری (pivotal) پوزیشن ہے۔ اس ضمن میں چوتھی بات عرض کر رہا ہوں کہ معاشرہ کی تنظیم (organization of the society) کا ذریعہ بھی نماز ہے۔ ہر محلے کے لوگ دن میں پانچ مرتبہ مسجد میں نماز کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص دور جا کر کام کرتا ہے‘ تب بھی وہ ظہر کو چھوڑ کر باقی چار نمازیں تو محلے کی مسجد میں ادا کرے گا۔ چلیے عصر میں بھی کوئی نہیں پہنچ پایا تو پھر بھی فجر‘ مغرب اور عشاء میں تو آئے گا اور ان میں آپ کو معلوم ہے کہ قراء ت جہری ہے یعنی بلند آواز سے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان نمازوں کو خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ اس میں اب تنظیم ہو رہی ہے کہ کون آیا‘ کون نہیں آیا اور جو نہیں آیا تو اس کے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟ کوئی بیمار ہو گیا ہے یا کسی کو کوئی اور عذر لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی ایک تشویش‘ اس کا ایک خیال‘ اس کا ایک احساس پیدا ہوگا۔ اور اگر کوئی مسلسل غیر حاضر ہے تو اس کے بارے میں زیادہ تشویش ہوگی کہ یہ دین سے بہت دور جا رہا ہے یا منافقین کی فہرست کے اندر کہیں اس کا نام درج ہونے لگا ہے۔ اس سارے معاملے کا ذریعہ محلے کی مسجد کی نماز ہے۔

اب اس سے ذرا آگے چلتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار جامع مسجد کے ساتھ ایک بڑی آبادی کے لوگوں کی تنظیم ہو رہی ہے۔ اس وقت بد قسمتی سے ہمیں یہ سہولت حاصل نہیں ہے‘ اس لیے کہ اب تو ہر مسجد جامع مسجد بن گئی ہے‘ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی مسجدوں

کے اندر جمعہ کی نماز نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پورے شہر کی ایک جامع مسجد تو اب نہیں ہو سکتی‘ پچاس ساٹھ لاکھ آدمیوں کے لیے ایک جامع مسجد تو نہیں ہو سکتی‘ لیکن یوں سمجھئے کہ آج کل ہمارے ہاں یہ جو محلے‘ کالونیاں اور ٹاؤنز بنے ہوئے ہیں‘ ان میں تو ایک جمعہ ہونا چاہیے ۔ جیسے ماڈل ٹاؤن میں تو ایک جمعہ ہو سکتا ہے (جیسے یہاں عید کی نماز ایک ہوتی ہے۔) یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ناممکن ہو۔ یا کم از کم ایک ٹاؤن کے ہر بلاک میں تو ایک جمعہ ہو۔ یہ تو نہیں کہ ایک ایک بلاک کے اندر تین تین‘ چار چار مسجدیں ہیں اور ہر جگہ جمعہ ہو رہا ہے۔ بہر حال جمعہ کے نظام سے ایک بڑی آبادی جمع ہوتی ہے اور پھر عیدین میں اس سے بڑا ایک اجتماع ہے۔ اور حج کے موقع پر عالمی سطح پر پوری مسلم برادری کا ایک اجتماع ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اضافی فائدہ ہے اس اقامتِ صلاۃ کا۔ اس میں پورا معاشرہ چاق و چوبند ہے اور ہر فرد کے بارے میں احساس پیدا ہو رہا ہے۔

نماز سے منسلک دو اہم چیزیں

اسلام نے نماز کے ساتھ دو چیزیں اور وابستہ کر دی ہیں۔ نظامِ عدالت کی ایک بڑی اہم بات نماز کے ساتھ منسلک ہے۔ اسلام کے عدالتی نظام میں تزکیۃ الشہود کا قاعدہ رائج ہے کہ ہر ایرے غیرے' نتھو خیرے کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی۔ گواہ کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی اس کی آبادی کے رہنے والے کچھ لوگ تصدیق کریں گے کہ ہاں یہ شخص نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے کردار میں کوئی ایسی خامی نہیں ہے کہ جس کی بنا پر اس کی گواہی قابل اعتماد نہ ہو۔چنانچہ تزکیۃ الشہود کے اندر اہم ترین اور پہلی بات نماز کی پابندی ہے۔گویا اقامت ِ صلاۃ کے ساتھ آپ کا نظامِ عدل بھی وابستہ ہو گیا۔

اسی سے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلام کے نظامِ اراضی کو مستنبط کیا ہے کہ اسلام میں زینداری کا کیا نظام ہے اور اس کے کیا احکام ہیں۔پہلی بات یہ کہ مسجد وقف ہے یعنی مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہے ۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:((جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَھُوْرًا))(صحیح البخاری' کتاب الصّلاۃ)''میرے لیے پوری زمین مسجد اور پاکی (تیمم)کا ذریعہ بنا دی گئی ہے''۔اس اعتبار سے گویا پوری کی پوری زمین اللہ کے لیے

وقف ہے اور یہ کسی کی ملکیت نہیں۔یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا' صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ اس سے آپ کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوں گے اور پھر آپ سوچیں گے' غور کریں گے۔ پہلے کوئی بات معلوم ہو تو پھر اس سے سوالات اُبھرتے ہیں اور سوالات کے حل کے لیے جب انسان کوشاں ہوتا ہے تو علم آگے بڑھتا ہے۔ اسی طریقے سے علم کی پیش قدمی ہوتی ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا گیا ہے کہ جیسے نماز کی جگہ پر آکر جو شخص بیٹھ گیا اسے کوئی وہاں سے اٹھا نہیں سکتا -------- یہ نہیں کہ بڑا چودھری آگیا ہے' تم یہاں سے ہٹ جاؤ' یا فلاں صاحب آگئے ہیں' پہلی صف خالی کر دو۔ قطعاً نہیں ! جو پہلے آیا اسی کا حق ہے -------- اسی بنیاد پر یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ بنجر اور بے آباد زمین کو جو شخص بھی آباد کر لے وہ اُسی کے پاس رہے گی' آپ اس کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتے۔ میں لفظ ملکیت استعمال نہیں کر رہا' لیکن اس کے استعمال کا حق اس کے پاس ہے اور آپ اس سے اس کا وہ حق چھین نہیں سکتے۔

اسی سے تیسری بات یہ مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص تین سال تک اپنی زمین کو بلا کاشت چھوڑ دیتا ہے تو اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔اب جو شخص اسے پھر قابل کاشت بنا کر کاشت کرے گا تو وہ اس کے پاس رہے گی۔اسی طرح جو شخص مسجد میں اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جائے وہ واپس آکر جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جائے۔ ہمارے ہاں جو نشانیاں رکھ دی جاتی ہیں' اس کو آپ کسی حد تک قابل قبول کہہ سکتے ہیں' لیکن مستقل اپنی جگہ reserve کروالینا صحیح نہیں ہے۔آپ جا رہے ہیں تو پھر جو جگہ آپ کو ملے وہاں آکے بیٹھیں۔

اقامت ِصلاۃ اور نظام ِحکومت کا باہمی تعلق

آخری بات کہہ رہا ہوں کہ اسلام کے پورے نظامِ حکومت کو نماز اور اقامت ِ صلاۃ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے دین اور سیاست کی وحدت کی بات کی ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دین اور سیاست کی وحدت یا دین اور ریاست کی وحدت' ان کا انضمام' ان کا جڑ جانا' ان کا پیوست ہو جانا اس حوالے سے ہے کہ ریاست کا صدر' وزیراعظم' خلیفہ یا صوبے کا گورنر ہی اس شہر کی جامع مسجد کا خطیب ہو گا ۔گویا خطبہ جمعہ کو نظامِ حکومت سے وابستہ کیا گیا ہے۔ آج ہمارا نظام چونکہ اسلامی نظام نہیں ہے اس لیے سارا معاملہ درہم برہم ہے' ورنہ کسی مسجد میں کوئی شخص اپنی آزاد مرضی سے خطبہ نہیں دے سکتا۔ خطیب حکومت کی طرف سے معیّن اور مقرر ہو گا' اس لیے کہ درحقیقت جمعہ کی خطابت نظامِ حکومت کا جزو ہے۔

آپ محلوں میں مسجدیں بنالیں اور ان میں نماز ادا کریں تو کوئی حرج نہیں۔ بس یہ ہے کہ وہاں خطبہ نہیں ہو گا ۔جہاں خطبہ ہو گا وہاں حکومت کا معاملہ شروع ہو جائے گا اور وہاں کا انتظامی سربراہ خطبہ دے گا۔ اگر وہ کوئی گرداوری کا حلقہ ہے تو گرداور یا قانون گو وہاں نماز پڑھائے گا۔ اگر آپ پٹواری کے حلقے کو یونٹ قرار دے دیں تو پٹواری نماز پڑھائے گا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ اوپر چلتے جایئے۔ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے تو تحصیل دار نماز پڑھائے گا۔ ضلعی ہیڈ کوارٹر ہے تو ڈپٹی کمشنر اور صوبائی دارالحکومت ہے تو گورنر نمازِ جمعہ کی امامت اور خطابت کرے گا اور اگر دار السلطنت اور دار الخلافہ ہے تو خلیفہ وقت یا سربراہِ مملکت وہاں کا خطیب ہو گا۔ وہ جمعہ کی نماز کی امامت بھی کرائے گا اور خطابت بھی۔

اس طریقے سے پورے اسلامی نظام کو اس نظامِ صلاۃ کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ نماز کا ایک باطنی اور انفرادی پہلو ہے جس پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہو گئی تھی اور انسان کے کردار' تعمیرِ سیرت ' روحانی ترقی ' فکر صحیح کے ارتقاء کے لیے نماز کی اہمیت بیان کردی گئی تھی۔ پھر یہ کہ اس نظام کے جملہ پہلو جو ممکن ہو سکتے ہیں' میں نے ان سب کو آپ کے سامنے ایک ایک کر کے بیان کر دیا ہے۔ یوں کہا جا

سکتا ہے کہ درحقیقت اقامتِ صلاۃ اور نظامِ صلاۃ کو پورے اجتماعی نظام میں نیوکلیئس اور محور کی حیثیت حاصل ہے ۔گویا نماز وہ لنگر ہے جس کے ساتھ اسلام کے نظامِ اجتماعی کا پورا جہاز منسلک ہے۔

میں اپنی گفتگو علامہ اقبال کے ایک شعر پر ختم کر رہا ہوں۔ہمارا جو اس وقت کا نظام ہے' ہماری نمازیں اور خطیب ہیں' اس پر اگرچہ بڑے تلخ انداز میں 'مگر صحیح ترین تعبیر کے

ساتھ علامہ اقبال نے پھبتی چست کی تھی ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟

اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام !

ہم نے مسجد کی امامت کو اس طرح degrade کیا ہے کہ اسے ایک علیحدہ نظام بنا دیا ہے جس کا پورے نظامِ زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ امامت اپنی جگہ پر ایک پروفیشن بن گیا ہے' حالانکہ امامت کی عظمت کے بارے میں تو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں خود امام تھے' پھر حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' علی(رضوان اللہ علیہم اجمعین) مرکزی جگہ پر امام تھے۔ گورنرز اپنے صوبوں میں امام تھے۔اس طریقے سے دین 'دنیا اور سیاست کو آپس میں جوڑنے والی شے نماز کا نظام ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اقامتِ صلاۃ کی اصل حقیقت پر متنبہ کیے رکھے اور ان دونوں خطابات کے ذریعے سے جو باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں اور ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے 'اللہ تعالیٰ اس پر فوری طور پر صحیح معنوں میں ہمیں عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یاربّ العالمین !

اقول قولى هٰذا واستغفر الله لى ولكم ولسائر المسلمين والمسلماتoo